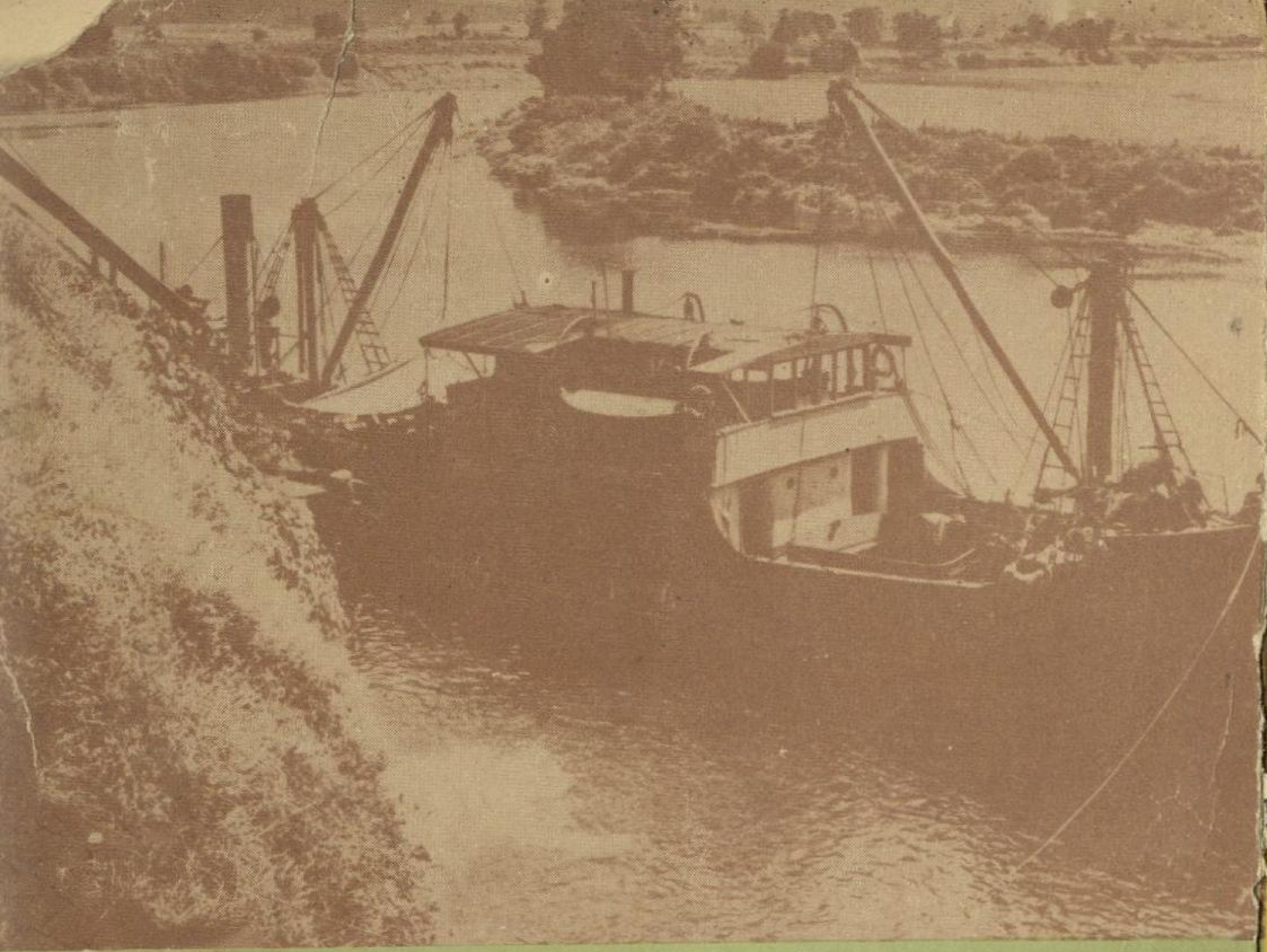


سرزمین اور باشندے

آسٹریلیا

مصنف

ڈفری بلنڈن

عبدالحمید قریشی

قیمت چار روپے

شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز

سرزمین اور باشندے

آسٹریلیا

سرزمین اور باشندے

آسٹریلیا

تصنیف : گوڈفرے بلنڈن

ترجمہ : عبدالحمید قریشی

مراجعت : پروفیسر سیّد ناظر حسن زیدی

ناشرین

شیخ غلام علی اینڈ سنز پرنٹرز، پبلشرز

لاہور ——— پشاور ——— حیدرآباد ——— کراچی

(FIRST EDITION)

PRINTED IN PAKISTAN

طبع اوّل ١٩٦٣ء
تعداد .. .. دو ہزار ایک سو
طابع .. .. شیخ نیاز احمد
مطبع .. .. علمی پرنٹنگ پریس لاہور
قیمت فی جلد .. .. .. چار روپے

ناشرین
شیخ غلام علی اینڈ سنز ۔ کشمیری بازار ۔ لاہور
بہ اشتراک
مؤسسہ مطبوعاتِ فرینکلن لاہور ۔ نیویارک

فہرست مضامین

پہلا باب

طویل فاصلے

برّاعظم آسٹریلیا کا حال معلوم کرنے سے پہلے اس کا محلِّ وقوع جاننا ضروری ہے۔ یہ برّاعظم نصف کرۂ جنوبی میں جنوبی مشرقی ایشیا کے عین جنوب میں واقع ہے۔ کُرے پر دیکھنے سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ دس درجے اور چالیس درجے عرض البلد جنوبی کے درمیان واقع ہے اور ۱۱۵ درجہ طول البلد شرقی سے شروع ہو کر ۱۵۵ درجہ طول البلد شرقی تک پھیلا ہُوا ہے۔ آسٹریلیا کرۂ ارض کے بعض ممالک کے بالکل بالمقابل واقع ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو انگلستان کے بالکل "نیچے" پایا جائے گا۔ اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ آسٹریلیا کے ملک میں رہنے والے زمین پر سَر کے بل چلتے ہیں۔ زمین کے ساتھ چکّر کھاتا ہُوا انسان کہیں بھی ہو، ہر جگہ زمین اور آسمان کی سمتیں ایک جیسی دکھائی دیں گی اور زمین کے بالکل دوسری طرف پہنچ جانے پر بھی اس میں کوئی فرق محسوس نہ ہوگا۔

آسٹریلیا کو "جزیرہ اعظم" بھی کہا جاتا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ہر طرف وسیع سمندروں سے گھرا ہُوا ہے۔ اس کے جنوب میں بحرِ جنوبی، مغرب میں بحرِ ہند اور مشرق میں بحرالکاہل جیسا وسیع سمندر واقع ہے۔ شمال میں ایک تنگ سمندر اسے جزائر شرق الہند سے علیحدہ کرتا ہے جس میں بہت سے چھوٹے چھوٹے جزیرے واقع ہیں۔ آسٹریلیا کا رقبہ ۳۰ لاکھ مربع میل کے قریب ہے جو ریاست ہائے متحدہ امریکا کے برابر اور انٹارکٹیکا سے زیادہ ہے۔ یہ مغربی پاکستان سے تقریباً دس گنا بڑا ہے۔

جب دوسری جنگ عظیم کے دوران میں جنرل جارج سی، مارشل نے جنگی دفاع کی غرض سے آسٹریلیا کا مطالبہ کیا تو اس کی یہ رائے تھی کہ "جغرافیائی لحاظ سے اس برّاعظم کے فاصلے اس قدر طویل ہیں کہ ان کی وجہ سے اس کے دفاع کا انتظام نہایت مشکل ہے۔" آئیے سب سے پہلے آسٹریلیا کے طبعی حالات معلوم کریں۔

اس برّاعظم میں سب سے نمایاں چیز وہ عظیم سلسلۂ کوہ ہے جو اس کے مشرقی حصّے میں جنوب تک چلا گیا ہے۔ شروع میں یہ مسلسل نہیں، لیکن برّاعظم کے جنوب مشرق میں پہنچ کر یہ ایک مسلسل سلسلۂ کوہ کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اس حصّے میں اس کی بعض بلند چوٹیاں جو سطحِ سمندر سے سات ہزار فٹ سے زیادہ اونچی ہیں، موسمِ سرما میں برف سے ڈھک جاتی ہیں۔ ان میں بلند ترین چوٹی "کوسی لیسکو" سطحِ سمندر سے ۷۳۲۸ فٹ اونچی ہے۔ اگرچہ ان کو آسٹریلوی الپس کہا جاتا ہے لیکن سوئزر لینڈ کے کوہ الپس اور اِن میں کوئی مشابہت نہیں جو اس سے دُگنے سے بھی زیادہ اونچے ہیں۔

چونکہ یہاں ایسا کوئی پہاڑی سلسلہ نہیں ہے جس کی چوٹیاں ہمیشہ برف سے ڈھکی رہیں۔ اس لیے امریکا اور ایشیا کی طرح اس برّاعظم میں بڑے بڑے دریا نہیں ہیں، لیکن بعض دریا عظیم سلسلۂ کوہ ہیں سے نکل کر بحرالکاہل میں گرتے ہیں۔ ان دریاؤں کے دہانے ریت سے اٹے ہوئے ہیں جس کی وجہ سے جہاز ان میں داخل نہیں ہو سکتے۔ عظیم سلسلۂ کوہ ہیں سے دریاؤں کے دو بڑے سلسلے مغرب کی طرف بھی بہتے ہیں۔ ان میں سے شمالی حصّے میں بہنے والے دریا وسطی آسٹریلیا کی نمکین جھیلوں اور نشیبی علاقوں میں ختم ہو جاتے ہیں، لیکن جنوب کو نکلنے والے تمام دریا اس حصّے کے بڑے دریا مرے کے مُعاون بن جاتے ہیں۔ برّاعظم کے وسطی حصّے میں اور مغربی ساحل کے قریب بھی کچھ شکستہ اور خشک پہاڑی سلسلے ہیں لیکن

ان میں سے کوئی بھی سطحِ سمندر سے دو یا تین ہزار فٹ سے زیادہ اونچا نہیں اور ان سے نکلنے والے دریا اگرچہ مقامی طور پر کافی مفید ہیں لیکن مجموعی طور پر ان سے برّاعظم کو کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچتا۔

انسان پانی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس وجہ سے آسٹریلیا کی آبادی کا بیشتر حصّہ اس کے مشرق اور جنوب مشرق میں ساحلِ سمندر کے ساتھ ساتھ رہتا ہے۔ سارے برّاعظم کا صرف ایک تہائی سے کچھ ہی زیادہ علاقہ کاشت کے قابل ہے۔ اس میں سے بھی صرف نصف زمین زیرِ کاشت ہے۔ زیادہ حصّہ ایک صحرا ہے۔

برّاعظم آسٹریلیا کا ساحل بیشتر بلند اور چٹانی ہے۔ وسیع سمندروں کی بڑی بڑی لہریں ہر وقت ان چٹانوں کے ساتھ ٹکراتی رہتی ہیں، چونکہ جہاز دریاؤں کے راستے ملک میں داخل نہیں ہو سکتے، اس لیے قدرتی بندرگاہوں کی کمی ہے۔ جس جگہ بھی کوئی محفوظ بندرگاہ ہے، وہاں شہر آباد ہو گئے ہیں جیسے شہر سڈنی، پورٹ جیکسن پر اور شہر میلبورن، پورٹ فلپ پر آباد ہیں۔

جنوبی آسٹریلیا کی آب و ہوا رومی خطّے کی سی یعنی خشک اور معتدل ہے۔ یہاں سب سے گرم مہینوں کا اوسط درجہ حرارت ۶۵° سے ۷۰° تک اور موسمِ سرما میں ۴۵° سے ۵۵° تک رہتا ہے۔ برّاعظم کے شمال میں آب و ہوا منطقہ حارہ کی سی ہے، یہاں مون سون ہوائیں بارش لاتی ہیں۔ اس جگہ گرمیوں کے موسم میں درجۂ حرارت ۸۵° سے ۱۰۰ فارن ہائیٹ تک رہتا ہے، چونکہ یہ ملک نصف کرّہ جنوبی میں واقع ہے، اس لیے یہاں کے موسم پاکستان کے برعکس ہوتے ہیں۔ یہاں کرسمس (بڑا دن) گرمیوں کے موسم میں آتا ہے اور جولائی کے مہینے میں خوب سردی ہوتی ہے۔

یہاں بعض اوقات، عرصے تک خوب گرمی پڑتی ہے۔ سڈنی یا میلبورن میں بھی موسمِ گرما میں اکثر درجہ حرارت ۱۰۰ فارن ہائیٹ سے بڑھ جاتا ہے۔ وسط کے

خشک علاقوں میں دیر تک سخت گرمی رہتی ہے۔ مغربی آسٹریلیا کے شمال مغرب میں ماربل بار میں جو اس جگہ صرف کانوں کی وجہ سے آباد ہو گیا ہے ایک سال ۱۰۳ دن سے زیادہ عرصے تک درجہ حرارت ۱۰۰ فارن ہائیٹ سے زیادہ رہا۔

آسٹریلیا میں بارش کی بہت کمی ہے۔ صرف جنوب مشرقی اور جنوب مغربی ساحلوں پر بارش ۴۵ - انچ یا اس سے کچھ زیادہ ہوتی ہے۔ عظیم سلسلہ کوہ یا فاصلِ اعظم کی مغربی ڈھلانوں پر سالانہ بارش کی مقدار دس سے بیس انچ تک ہے۔ ان علاقوں کے علاوہ باقی تمام برّاعظم میں، بارش دس انچ سالانہ سے بھی کم ہوتی ہے۔ بارش ہو جائے تو فصلیں نہایت عمدہ ہوتی ہیں، لیکن جہاں بارش کی کمی ہے، وہاں کچھ بھی پیدا نہیں ہوتا۔ برّاعظم کے وسطی حصّے میں جب بھی بارش ہو، خشک ہواؤں کی وجہ سے زمین فوراً خشک ہو جاتی ہے۔ برّاعظم کے مختلف حصّوں میں ہر چند سال بعد خشک سالی واقع ہوتی ہے اور کبھی کبھی سارے برّاعظم میں بارش کی ایک بوند بھی نہیں برستی۔ اس وقت سارے برّاعظم کو سخت مصیبت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بعض دفعہ ساحلی علاقوں میں بھی ضرورت کے مطابق بارش نہیں ہوتی۔ اس وقت فصلیں تباہ ہو جاتی ہیں اور جانوروں کی کثیر تعداد تلف ہو جاتی ہے۔

آسٹریلیا کے شمالی ساحل پر کبھی کبھی منطقۂ حارہ کے تُند اور تیز طوفان آتے ہیں، لیکن چونکہ یہ علاقے غیر آباد ہیں اس لیے زیادہ نقصان نہیں ہوتا۔ باد و باراں کے شدید طوفان بحرِ جنوبی کی طرف سے بھی آتے ہیں، لیکن خشکی کے اندر کچھ دُور جانے کے بعد اُن کا زور کم ہو جاتا ہے۔ ریاست ہائے متحدہ کے وسطی مغربی حصّوں کے سے گردباری طوفان یہاں نہیں آتے۔ مجموعی طور پر اس برّاعظم میں اکثر سکون رہتا ہے اور فضا گرم اور غنود آلودہ سی رہتی ہے۔ اس ملک کا بیشتر حصّہ ہموار اور چٹیل ہے۔ جہاں دُور تک بھوری اور سیاہی مائل زمین دکھائی دیتی ہے اور کسی جگہ اس میں کوئی تبدیلی

نہیں ملتی۔

سطحی نظر سے دیکھنے سے اس سرزمین میں کوئی دلچسپ چیز دکھائی نہیں دیتی۔ یہی وجہ ہے کہ آج سے صدیوں پہلے جو لوگ شمال سے اپنے بادبانی جہازوں اور مختلف اقسام کی چھوٹی بڑی کشتیوں میں یہاں آئے، وہ یہاں کے سنگلاخ ساحل اور اس سے آگے کی بنجر اور خشک زمین کو دیکھنے کے بعد اپنے زرخیز اور آباد ملکوں کو واپس چلے جاتے تھے۔ یورپ کے وہ لوگ جنھوں نے برِّاعظم آسٹریلیا کی عجیب و غریب "خوبصورتی" سے دلچسپی لی ان سے بہت عرصے کے بعد یہاں پہنچے۔ ان میں ایسے سائنس داں اور قابل لوگ بھی تھے جن کو اس سرزمین میں بہت سی نئی اور عجیب باتیں معلوم ہوئیں۔

دوسرا باب

آغازِ حیات کی نشانیوں سے بھرپور سرزمین

علمِ طبقات الارض کے لحاظ سے آسٹریلیا ایک ایسا ہموار قطعۂ زمین ہے جو بہت ہی قدیم زمانے میں سطحِ سمندر سے اُبھرا۔ درحقیقت برّاعظم آسٹریلیا دُنیا کی بہت ہی پرانی سطحِ ارض ہے۔ بہت قدیم زمانے میں جب زمین ابھی نہایت گرم تھی تو اس کے کچھ حصّے بلند ہو کر میدان بن گئے اور دوسرے حصّے نیچے دب گئے اور اس طرح اس کی سطح میں بڑے بڑے شگاف پیدا ہو گئے۔ جب زمین کی سطح کچھ ٹھنڈی ہوئی تو سمندروں کے ساحلوں کے قریب عجیب وغریب پودے اور جانور نمودار ہو گئے۔ اس کے بعد پھر ایک شدّت کا دَور آیا۔ اس وقت سطحِ زمین پر اتنی تبدیلیاں ہوئیں کہ جنگل زمین کے نیچے دب گئے اور بعد میں کوئلے کی شکل میں تبدیل ہو گئے۔ اُس وقت کے بہت سے جانور بھی غائب ہو گئے۔ اس دَور میں برّاعظم آسٹریلیا کے مشرقی ساحل کے قریب چٹّان دار پہاڑوں کا ایک سلسلہ اُبھر آیا اور اس کے وسطی حصّے میں سمندر موجیں مارنے لگا۔ اس کے بعد پھر کروڑوں سال گزر گئے۔ اب سطحِ زمین پر کچھ پودے اُگ آئے اور کچھ بچے ہوئے جانور تعداد میں بڑھنے لگے، لیکن ان میں زیادہ تر مختلف قسموں کے سانپ اور دوسرے حشرات الارض اور مگرمچھ وغیرہ ہی تھے جو دریاؤں میں سے بہتے بہاتے اس بند سمندر میں پہنچ گئے۔

اس کے بعد کئی برفانی دَور آئے۔ اس وقت سطحِ زمین کے پانی کی اس قدر زیادہ مقدار منجمد ہو گئی کہ سمندر بہت کم گہرے رہ گئے اور سمندر کا پانی اپنی موجودہ

سطح سے تین سو فٹ نیچے چلا گیا۔ اس طرح خشکی کی ایک تنگ سی پٹی سمندر سے باہر نکل آئی اور اس تنگ راستے سے آسٹریلیا کا سب سے شمالی کونا ایریان یعنی ایشیا سے مل گیا۔ ایسی ہی ایک اور تنگ پٹی کے ذریعے سے جنوب میں تسمانیہ کا جزیرہ بھی برّاعظم آسٹریلیا کے ساتھ مل گیا۔

علم طبیعیات کے ماہر خیال کرتے ہیں کہ آسٹریلیا کے تھیلی رکھنے والے جانور اور یہاں کے قدیم باشندے اِنھی راستوں سے یہاں پہنچے۔ برف کے آخری دَور کے خاتمے پر جب برف پگھلی تو سمندر کی سطح اونچی ہو جانے سے یہ تنگ راستے غرق ہو گئے۔

یہاں تک، آسٹریلیا کی تاریخ دُنیا کے دوسرے حصّوں سے زیادہ مختلف نہیں۔ برف کے زمانے کی تبدیلیوں نے دنیا کے دوسرے حصّوں کی نسبت آسٹریلیا کے ہموار میدان پر بہت کم اثر کیا۔ یہاں برف کے دریا مشرقی سمندر کی طرف بہتے رہے، لیکن یہ نصف کرۂ شمالی کے بڑے بڑے یخ کے دریاؤں کی نسبت بہت چھوٹے تھے۔ جب سطح زمین پر وہ تبدیلیاں ہوئیں جن کی وجہ سے کوہِ راکی اور ایشیا کے کوہِ ہمالیہ جیسے بلند تہ دار پہاڑ نمودار ہوئے تو آسٹریلیا پر اس کا زیادہ اثر نہ ہوا۔ کسی کسی جگہ زمین کے اونچا ہو جانے سے برّاعظم کا اندرونی سمندر علیحدہ ہو گیا۔ اور آہستہ آہستہ اس کا پانی سُوکھنے لگا۔ جب سمندر کی تہ بالکل ننگی ہو گئی تو گرمی اور سردی کے اثر سے عرصۂ دراز کے بعد یہ ایک پتھریلا ریگستانی علاقہ بن گیا۔ جو اس وقت برّاعظم کے وسطی حصّے میں واقع ہے۔ ہوا اور بارش کی وجہ سے تہ دار پہاڑی سلسلے گھستے رہے، یہاں تک ان میں سے کچھ محض اونچے ٹیلے رہ گئے اور ان میں سے بلند ترین پہاڑ بھی زیادہ اونچے نہ رہے۔

پہلے اندرونی سمندر میں گرنے والے دریاؤں نے بہت سی ریت اور مٹی پہاڑوں کے مغربی میدانوں میں لا کر ڈال دی، لیکن جب پہاڑ کم اونچے رہ گئے اور سمندر

چھوٹی چھوٹی نمکین جھیلوں میں تبدیل ہو گیا تو یہ دریا بھی چھوٹے ہوتے گئے اور آخرکار بالکل غائب ہو گئے۔ باقی تمام برّاعظموں میں اور بعض جزیروں پر آتش فشاں پہاڑ موجود ہیں جن میں سے پگھلا ہوا لاوا نکلتا رہتا ہے لیکن اس برّاعظم کا آخری آتش فشاں پہاڑ شاید آج سے بیس ہزار برس پہلے بُجھ چکا تھا اور اُس سے بہت پہلے یہاں سکون ہو چکا تھا۔ یہاں کی زمین آہستہ آہستہ گرم اور خشک ہو رہی تھی، لیکن یہ سب کچھ اس قدر سُست رفتار سے ہو رہا تھا کہ جاندار چیزیں ان تبدیلیوں کے ساتھ اپنے حالات کو بدلتی رہیں اور زندگی بدستور قائم رہی۔

علم طبقات الارض کے ماہر چٹانوں کے مشاہدے سے گزشتہ حالات معلوم کر سکتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ برّاعظم آسٹریلیا میں بیس کروڑ برس سے یہاں جاندار بالکل الگ تھلگ زندگی بسر کرتے آئے ہیں۔ اس وجہ سے یہاں پودوں، جانوروں اور کسی حد تک انسانی زندگی میں کوئی بڑی تبدیلی نہیں ہوئی۔ اس لحاظ سے آسٹریلیا ایک گزرے ہوئے زمانے کا عجائب گھر ہے۔ اُن کے کہنے کے مطابق یہ سرزمین آغازِ حیات کی زندہ نشانیوں سے بھرپور ہے۔ یہاں کے موجودہ حالات بتانے سے پہلے ہم اگلے ابواب میں اس "عجائب گھر" کا مطالعہ کریں گے۔

تیسرا باب

پودے اور پھول

جب یورپ سے علمِ طبیعیات کے ماہر پہلے پہل آسٹریلیا پہنچے تو وہ اسے دیکھ کر بہت حیران ہوئے۔ انھوں نے ایسا محسوس کیا کہ گویا وہ دُنیا کے ایک کنارے پر کھڑے ہو کر تاریخ سے قبل کے بہت قدیم زمانے کے حالات دیکھ رہے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس وقت یہاں بہت سے ایسے پودے اور درخت موجود ہیں جو دُنیا کے دوسرے حصّوں میں صرف زمین کے نیچے کوئلے کی شکل میں ملتے ہیں۔ بعض پودے زمین پر اُگنے کے بجائے دوسرے درختوں کے تنوں پر پیدا ہوتے ہیں، اور ان میں سے کچھ بیس فٹ کی بلندی تک پہنچ جاتے ہیں۔ بعض درختوں پر تیز کناروں والے گھاس کے گچھّے پیدا ہوتے ہیں۔ جن میں ڈنٹھل دار پھول لگتے ہیں۔ تیاں پام کے پودوں سے مشابہت رکھنے والے سائیکاڈ کے درخت بھی اِس وقت تک موجود ہیں جو درحقیقت نہایت قدیم پودوں کی ایک قسم سے تعلق رکھتے ہیں۔

یہاں کا سب سے عام درخت یوکلپٹس ہے۔ دنیا کے دوسرے حِصّوں میں یہ درخت چٹانوں کے اندر پایا جاتا ہے، جس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ نہایت قدیم زمانے کے جنگلوں میں یہ درخت بھی شاہ بلوط اور دوسرے نوک دار پتوں والے درختوں کے ساتھ پیدا ہوتا تھا۔ صرف آسٹریلیا میں اس کی یہ اقسام قائم رہیں۔ قدیم زمانے کے یوکلپٹس کے درخت کے پتے اپنا چہرہ اوپر کی طرف رکھتے تھے، لیکن اِس گرم برّاعظم میں اس پودے کے پتے یا تو نیچے کی طرف جھکے رہتے ہیں یا ان کا صرف ایک کنارہ سُورج

کے رُخ میں ہوتا ہے۔ اس کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ یہاں اس درخت کی ٹہنیوں کے نیچے کبھی گھنی چھاؤں نہیں ہوتی۔

یہاں یوکلپٹس کی ساڑھے تین سو سے زیادہ قسمیں ہیں، جن میں بلند پہاڑوں پر پیدا ہونے والے گٹھیلے سفید گوند والے یوکلپٹس کے درختوں سے لے کر ریگستانوں میں اُگنے والے گرہ دار پودے شامل ہیں جو اپنی جڑوں میں پانی کا ذخیرہ جمع رکھتے ہیں۔ ان کے درمیان وہ شاندار پہاڑی جنگلی یوکلپٹس کے درخت ہیں، جو وکٹوریہ کے جنوبی حصّے کے مرطوب جنگلوں میں پیدا ہوتے ہیں، اور جن کی بلندی تین سو فٹ تک پہنچ جاتی ہے۔ یہ امریکا کے دیوداروں کی طرح نہایت سیدھے اور ان سے بھی زیادہ اونچے ہوتے ہیں۔ آسٹریلیا کے جنوب مشرقی کونے میں یوکلپٹس کی کئی اور قسمیں بھی پائی جاتی ہیں۔ جن میں بعض کی لکڑی گہرے سُرخ رنگ کے مہاگنی کے درختوں سے ملتی ہے اور یہ دنیا میں کسی اور جگہ نہیں اُگتے۔ اس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جب اندرونی سمندر کی وجہ سے یہ برّاعظم دو حصّوں میں منقسم تھا تو یہ درخت عرصے تک بالکل علیحدہ رہے۔

یوکلپٹس کا درخت سدا بہار ہوتا ہے۔ اس کے پتّے خشک ہو کر گرتے رہتے ہیں لیکن کسی خاص موسم میں ان کی پت جھڑ نہیں ہوتی۔ کچھ ایسی قسمیں بھی ہیں جو موسم بہار میں اپنا چھلکا اتار دیتی ہیں۔ کچھ یوکلپٹس نہایت ہموار اور چکنی سطح رکھتے ہیں اور بعض کا چھلکا نہایت کھردرا ہوتا ہے۔ بعض کے پتے نہایت چوڑے ہوتے ہیں اور بعض کے تنگ۔ ان میں سے بعض ایسے یوکلپٹس کے درخت بھی ہیں کہ جب ان کو کاٹا جائے تو اُن میں سے بہت زیادہ خونیں رنگ کا رَس نکلتا ہے اور اسی وجہ سے ان کو گوند کے درخت کہتے ہیں۔ ایک چیز ان سب قسموں میں یکساں پائی جاتی ہے، کھلنے سے پہلے اُن کے پھولوں پر ایک سخت اور تنگ ٹوپی سی ہوتی ہے، اور اسی کی وجہ سے اس کو یوکلپٹس کا نام دیا گیا۔ یونانی زبان میں "یو" کے معنی کنوئیں کے ہیں اور "کلپٹس"

کا مطلب ہے "ڈھکا ہُوا" یوکلپٹس کے بیج خشک اور سخت پوست میں بند ہوتے ہیں اور سالہا سال تک مردہ نہیں ہوتے۔ جب تک انھیں ایک خاص قسم کی رطوبت اور حرارت نہ پہنچے، ان بیجوں میں سے پودا پیدا نہیں ہوتا۔ آج کل یوکلپٹس کے درخت دنیا کے بہت سے گرم خشک حصّوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ جنوبی کیلیفورنیا، پیرو، ترکیہ، یونان، فلسطین، مصر، پاکستان اور بھارت میں یوکلپٹس کے درخت بکثرت پیدا ہوتے ہیں، لیکن ان سب کے بیج آسٹریلیا ہی سے لائے گئے ہیں۔

یوکلپٹس کے پتّوں سے ایک تیز خوشبودار تیل حاصل ہوتا ہے۔ یہ خوشبو اس کی مختلف قسموں میں ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہے۔ ان میں سے بعض کی خوشبو لیموں سے ملتی ہے، بعض کی پیپرمنٹ جیسی ہوتی ہے اور بعض کی خوشبو تارپین کے تیل سے ملتی جلتی ہے۔ صاف کرنے کے بعد یہ تیل بہت سی دواؤں میں کام آتا ہے اور آسٹریلیا میں اسے اکثر سینے کے امراض میں استعمال کیا جاتا ہے۔ یوکلپٹس کے تمام درختوں کی لکڑی نہایت سخت اور بہت عمدہ ہوتی ہے، جس سے نہایت اچھا فرنیچر تیار کیا جاتا ہے۔ اس کی لکڑی سے پلائی وُڈ یعنی تہ دار تختے بھی بنائے جاتے ہیں۔ اس درخت میں کسی قاعدے کے مطابق پھُول نہیں آتے۔ لیکن جب بھی ان میں پھول آتے ہیں تو سارا درخت اُن سے بھر جاتا ہے۔ ان کے بھاری گچھے دار پھول مختلف رنگوں کے ہوتے ہیں، مثلاً گہرے سُرخ، شنگرفی، قرمزی، چمپئی، کپاسی وغیرہ۔ جب ان کے درخت پھولوں سے لدے ہوں تو نہایت خوبصورت معلوم ہوتے ہیں اور اس وقت پانچ چھ ہفتوں کے لیے شہد کی مکھیاں نہایت تیزی سے ان میں سے شہد جمع کرتی ہیں۔

یوکلپٹس کے بعد، برّاعظم آسٹریلیا کا دوسرا عام درخت کیکر ہے۔ کیکر یا ببول کے درخت دنیا کے تمام حصّوں میں پائے جاتے ہیں، لیکن ان کی ساڑھے سات سو قسموں میں سے پانسو اقسام صرف آسٹریلیا ہی میں ملتی ہیں۔ ان درختوں کی بھی مختلف شکلیں اور مختلف قامتیں

ہوتی ہیں۔ ان کی ایک قسم ڈیڑھ سو فٹ کی بلندی تک پہنچ جاتی ہے جس کی لکڑی سیاہ ہوتی ہے۔ ان بلند کیکر کے درختوں سے لے کر صحرا میں اُگنے والی چھوٹی چھوٹی کیکر کی جھاڑیوں تک، ان کی کئی قسمیں ہیں۔ خشک سالی میں مویشی ان جھاڑیوں کے پتوں پر گزارا کرتے ہیں۔ کیکر کے درختوں کی یہاں بیسیوں ایسی اقسام ہیں جن کو امریکا میں ممو سا کہتے ہیں، لیکن آسٹریلیا میں اسے ویٹل کہا جاتا ہے۔ سڈنی کے علاقے کے اوّلین آباد کار اس کو اپنی جھونپڑیاں تیار کرنے میں استعمال کرتے تھے۔ وہ اس کی مضبوط اور لچکدار ٹہنیوں سے جھونپڑیاں بنا کر اس پر گارے کا پلستر کر دیتے تھے۔ اس قسم میں سے سنہری کوٹا منڈرا ویٹل کا درخت جو پچاس فٹ کی بلندی تک پہنچ جاتا ہے موسم بہار کے شروع میں زرد پھولوں سے لد جاتا ہے اس لیے آسٹریلیا کے باشندے ویٹل کے پھول کو اپنا قومی نشان سمجھتے ہیں۔ اس کی بہار کے موقعے پر یعنی یکم اگست یا یکم ستمبر کو "یومِ ویٹل" ایک قومی تہوار کے بطور منایا جاتا ہے۔ اس موقع پر لاکھوں اشخاص اس کا پھول اپنے کوٹ میں لگاتے ہیں۔

برِاعظم آسٹریلیا میں دو قسم کے پودے اور درخت ملتے ہیں۔ ایک وہ جو شمال میں جزائر شرق الہند سے یہاں پہنچے، اور دوسرے وہ جن کا تعلق انٹارکٹیکا سے ہے۔ شمالی قسم کے نباتات میں عُنابی پھولوں والے پون سیانا کے درخت جو امریکا میں فلوریڈا اور میکسیکو کے علاقوں میں بھی پائے جاتے ہیں نیز کیسو رینا کی قسم کے شاہ بلوط اور مین گرد کے درخت ملتے ہیں۔ سنہرے پھولوں والے درخت جاسارنڈا، کورل اور فلیم بھی انھی کے ساتھ شامل ہیں جن میں چمکدار، آتشیں رنگ پھول آتے ہیں۔ ایک اور باہر سے آنے والا درخت بادباب ہے، جسے "دریافت کرنے والوں کا درخت" بھی کہتے ہیں، کیونکہ اس کے بوتل جیسے موٹے تنے میں شگاف کرنے سے پانی نکل آتا ہے خواہ اس وقت اس پودے کے گرد و نواح میں سال بھر سے پانی کی ایک بوند نہ پڑی ہو۔ شمالی حصّے میں

بہت سے چوڑے پتوں والے انجیر کی قسم کے درخت بھی پائے جاتے ہیں۔ کچھ سدا بہار نوک دار پتوں والے درخت بھی ملتے ہیں، جو چیل کے درختوں سے مختلف ہیں۔

قطبِ جنوبی کی قسم کے پودے زیادہ تر آسٹریلیا کے جنوبی ساحل سے آگے تسمانیا کے بڑے جزیرے میں پائے جاتے ہیں۔ ان میں بڑے بڑے فرن کی قسم کے پودے، سَدا بہار سفیدے کی قسم کے درخت ونٹر بارک اور دوسرے ایسے پودے پائے جاتے ہیں جو برف باری اور یخ کو برداشت کر سکیں۔ ان میں سے اکثر پودے دنیا میں اور کسی جگہ نہیں ملتے۔ برّاعظم انٹارکٹیکا کے نباتات کا ابھی تک پوری طرح مطالعہ نہیں کیا گیا، لیکن موجودہ خیال یہی ہے کہ آسٹریلیا اور اس برّاعظم میں نہایت گہرا تعلق ہے اور آسٹریلیا کے بہت سے عجیب و غریب پودے دراصل وہیں سے آئے ہیں۔

آسٹریلیا کے نباتات کا ذکر دو اور درختوں کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا، ان میں سے ایک بان کیاس ہے جس کا چھلکا ہاتھی کی جلد کی طرح خشک ہوتا ہے اور جس میں گھاس کے تنکوں جیسے نازک پھول لگتے ہیں۔ اور دوسرا درخت پیپر بارک ہے جو آسٹریلیا کے دُور جنوب مغرب میں دلدلوں کے کناروں پر اُگتا ہے۔ اس دوسری قسم کے درخت کا چھلکا اس کے اوپر سے سفید کاغذ کی طرح اتارا جا سکتا ہے۔ آسٹریلیا کے جنگلوں میں جو ایک خاص قسم کی خوشبو کا احساس ہوتا ہے اس کا ذکر بھی ضروری ہے۔ یہاں پہنچنے پر ایک عمدہ قسم کی نباتاتی خوشبو کے ساتھ قند کی خوشبو ملی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ یہ خوشبو زیادہ تیز نہیں ہوتی اور بہت سے پھولوں اور پودوں میں سے اس طرح ہوا کے جھونکوں سے مل کر آتی ہے کہ اسے پہچانا نہیں جا سکتا۔ یہ خوشبو فوراً آگے گزر جاتی ہے۔

علم نباتات کے ماہر برّاعظم آسٹریلیا کے پودوں اور درختوں کو بہت عجیب خیال کرتے ہیں۔ یہاں کا ہر پھول اور ہر پودا دنیا کے دوسرے حصّوں سے مختلف اور نہایت عجیب ہے اور یہ یہاں ہزاروں کی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ صرف ریاست

وکٹوریہ کے جنوب مغربی کونے میں تین ہزار سے زیادہ مختلف قسم کے جنگلی پھول پائے جاتے ہیں۔ جو اسی قدر رقبے کے علاقے میں دنیا کے کسی اور حصّے میں نہ ملتے ہوں گے۔ یہاں فلینل، ٹرگر، فیدر اور پی پھولوں کے علاوہ سیکڑوں قسم کی جھاڑیاں، مہندی کے پودے، فرنچ لینز، گریو یلیاز، ہیکیاز، بے شمار گھنٹی نما پھول اور ڈیزی کی قسم کے پھول پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے بعض براونیا کے پھول کی طرح بہت خوشبودار ہیں، اور بعض خوشبو سے خالی ہیں۔ بے بُو پھولوں میں سے کچھ مثلاً سُرخ رنگ کے گُلِ فرانھا اس قدر خوشنما ہیں کہ ان کو دیکھنے سے یہ محسوس ہوتا ہے جیسے کسی ماہر بُت تراش نے انھیں بنایا ہے۔ یہاں چمکدار کیڑے مکوڑوں جیسے گراؤنڈ اورکڈ اور نہایت معمولی شکل کے راک اورکڈ بھی پائے جاتے ہیں جو دوسرے ملکوں میں خوشبو سے خالی ہوتے ہیں لیکن یہاں ان میں سے بھینی بھینی خوشبو آتی ہے۔ یہاں اورکڈ پودوں کی ایک ایسی قسم بھی ہے جو کریپٹن تھیمس کہلاتے ہیں۔ یہ سطح زمین کے نیچے ہی پیدا ہوتے ہیں اور وہیں پھول لے آتے ہیں۔

برّ اعظم آسٹریلیا کی تمام ریاستوں میں سے مغربی آسٹریلیا میں نہایت عجیب و غریب اور بے حد دلچسپ جنگلی پھول بہ کثرت پائے جاتے ہیں۔ اس ریاست کا جنوب مغربی کونا جہاں ان پھولوں اور پودوں کی زیادہ قسمیں ملتی ہیں بہت عرصے سے آسٹریلیا کے دوسرے علاقوں سے اُس ایک ہزار میل لمبے میدان کی وجہ سے بالکل علیحدہ رہا۔ جو نلر بور کا میدان کہلاتا ہے۔ اس وجہ سے یہاں کے جنگلی پھول خود بخود بڑھتے اور ترقی کرتے رہے۔ سبز اور سُرخ کنگرو پاز کا ذکر بھی ضروری ہے جو بہت سی مخملی انگلیوں والے دستانے سے مشابہت رکھتا ہے۔ گیرل ٹن وکیس پودا بھی دلچسپی سے خالی نہیں جس کے مومی پھول بہت نازک اور گلابی رنگ کے ہوتے ہیں۔ مغربی آسٹریلیا خاص طور پر مختلف قسم کے اور عجیب و غریب اورکڈ پودوں سے پُر ہے۔

چوتھا باب

کنگارو اور پلیٹی پس

آسٹریلیا کے دیسی جانوروں میں سے بیشتر جانور تھیلی دار ہوتے ہیں۔ یعنی یہ اپنے بچوں کو ایک تھیلی میں لیے پھرتے ہیں۔ جب علمِ طبیعیات کے ماہروں نے پہلے پہل انھیں دیکھا تو وہ بہت حیران ہوئے اور اسے نظر کا دھوکا سمجھتے رہے۔ ان جانوروں کا صحیح مشاہدہ بہت دیر بعد ہو سکا۔ آسٹریلیا کے باہر دنیا کے دوسرے حصّوں میں صرف دو تھیلی دار جانور پائے جاتے ہیں، جن میں سے ایک شمالی امریکا کا اوپوسم ہے اور دوسرا جنوبی امریکا کا سیلوا۔ یہ دونوں گوشت خور جانور ہیں۔ آسٹریلیا اور اس کے گرد و نواح کے جزیروں میں اس وقت ڈیڑھ سو قسم کے تھیلی دار جانور پائے جاتے ہیں اور یہ سب سبزی خور ہیں۔

دنیا کے بہت سے حصّوں میں چٹانوں کے اندر سے قدیم زمانے کے تھیلی دار جانوروں کے نشانات ملے ہیں جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ دودھ پلانے والے جانوروں میں سے تھیلی دار جانور بہت قدیم قسم کے ہیں۔ تھیلی والے جانور دوسرے جانوروں سے صرف اسی بات میں مختلف نہیں ہیں کہ ان کے پاس اپنے بچّے رکھنے کے لیے قدرت کی دی ہوئی تھیلی ہوتی ہے بلکہ ان کے اور دوسرے جانوروں کے درمیان بڑا فرق یہ ہے کہ وہ نالی جس کے ذریعے ناف کے راستے ماں کے پیٹ میں بچے کو غذا ملتی ہے ان میں نہیں ہوتی۔ اس وجہ سے انھیں بچّے پیدا ہوتے وقت زیادہ تکلیف نہیں ہوتی اور نہ اتنا وقت صرف ہوتا ہے جتنا دوسرے جانوروں میں بچّے کی پیدائش کے وقت ہوتا ہے۔ لیکن تھیلی والے جانوروں کا نوزائیدہ بچّہ مقابلتہً نامکمل ہوتا ہے اور اگرچہ وہ سانس لے سکتا ہے لیکن

بالکل بے بسی کی حالت میں ہوتا ہے ۔ مادہ نوزائیدہ بچے کو اٹھا کر فوراً تھیلی میں ڈال لیتی ہے جو اس کے پستانوں پر ایک ڈھیلی سی جھلی کی شکل میں موجود ہوتی ہے ۔ اس کے بعد وہ بچے کے منہ کو اپنے پستان کے ساتھ لگا دیتی ہے ، چونکہ بچے میں ابھی دودھ کھینچنے کی طاقت نہیں ہوتی اس لیے مادہ خود اپنے پٹھوں سے کام لے کر بچے کے منہ میں دودھ پہنچاتی ہے ۔ اس طرح بچہ تھیلی ہی میں رہتا ہے اور مادہ اسے لیے پھرتی ہے ۔ یہاں تک کہ وہ اس قدر بڑا ہو جاتا ہے کہ کود کر باہر نکل آتا ہے اور گھاس کھانا شروع کر دیتا ہے ۔ اس کے بعد بھی جس وقت کوئی خطرہ ہو یہ کود کر پھر ماں کی تھیلی میں جا پہنچتا ہے اور وہ اسے لے کر بھاگ جاتی ہے ۔

ابتدا میں تھیلی والے جانور جو آسٹریلیا میں پہنچے بہت بڑی جسامت کے تھے اُن میں تھیلی دار شیر ببر اور ریچھ بھی تھے جو قد و قامت میں گینڈے کے برابر تھے اور اُن میں ایسے کنگارو بھی تھے جن کا قد دس سے پندرہ فٹ تک تھا ۔ ان جانوروں کی ہڈیاں پائی گئی ہیں ۔ اس وقت آسٹریلیا میں سب سے بڑا تھیلی والا جانور مشرقی میدانوں کا سُرخ کنگارو ہے ، جو قد میں انسان سے بھی اونچا ہوتا ہے ۔ یہ بڑا طاقتور جانور ہے ، تیس فٹ کی چھلانگ لگا سکتا ہے اور آٹھ فٹ اونچی باڑ کو پھاند جاتا ہے ۔ یہ پینتیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے بھاگ سکتا ہے ۔ ایک درجن کے قریب اور چھوٹے کنگاروؤں کی قسمیں بھی پائی جاتی ہیں جن میں سے بعض کو والابیز کہتے ہیں ۔ ان میں سے بعض کی پچھلی ٹانگیں دوسرے کنگاروؤں سے مختلف ہوتی ہیں اور یہ درختوں پر بھی چڑھ سکتے ہیں ۔ ان میں سے ایک قسم کے کنگارو خرگوش جتنے ہوتے ہیں ۔

دوسرے تھیلی دار جانوروں میں فالنجر کی قسم کے کنگرو شامل ہیں جن کو آسٹریلیا میں پوسم کہتے ہیں ۔ ان میں سے بعض کی دُمیں اتنی لمبی ہوتی ہیں کہ وہ اُن سے چیزوں کو پکڑ سکتے ہیں ۔ کچھ ایسے ہیں جن کی اگلی ٹانگوں اور جسم کے درمیان ایک ایسی جھلی

ہے جس کی مدد سے وہ ایک درخت سے دوسرے درخت تک پھسل کر پہنچ جاتے ہیں۔ ان کی نرم بھورے بالوں والی پوستین سے عورتوں کے نہایت عمدہ کوٹ بنائے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پکڑنے والوں نے ان کو بالکل ختم کر دیا ہے۔ آسٹریلیا کے بعض حصّوں میں اب ان کو پکڑنے کی ممانعت ہے۔ یہ نہایت دلچسپ جانور ہیں اور بہت جلد مانوس ہو جاتے ہیں۔ یہ عام طور پر رات کو جاگتے رہتے ہیں۔

ایک اور دلچسپ تھیلی دار جانور کوالا ریچھ ہے جس کے جسم پر بڑے نرم اور گھنے بال ہوتے ہیں اور وہ دیکھنے میں بچّوں کا کھلونا معلوم ہوتا ہے۔ آج کل یہ جانور بہت کمیاب ہے کیونکہ یہ صرف ایک خاص قسم کے یوکلپٹس کے پتّے کھاتا ہے۔ اسے پالا جا سکتا ہے۔ سڈنی اور میلبورن کے شہروں کے قریب ان کے لیے خاص فارم ہیں۔

بنڈی کوٹ اور وومباٹ زمین میں بل بنا کر رہنے والے تھیلی دار جانور ہیں۔ جو غاروں میں رہنے والے سُوروں اور ووڈچک سے بہت ملتے ہیں۔ بعض تھیلی دار جانور بہت ہی کمیاب ہیں جن میں اندھی چھچھوندر، چیونٹیاں کھانے والے وومباٹ، کیڑے مکوڑے کھانے والا ڈارموس اور چھوٹا ہنی موس ہے جو انسان کے انگوٹھے سے بڑا نہیں ہوتا اور پھُولوں میں سے شہد حاصل کرنے کے لیے اپنی لمبی ناک پھُول میں ڈال دیتا ہے۔ اکثر تھیلی دار جانور بے ضرر اور ڈرپوک ہوتے ہیں اور انھیں پالنا ممکن نہیں۔ ان میں سے صرف چند قسمیں گوشت خور ہیں۔ آسٹریلیا کی دھاری دار بلّی اور تسمانیا کا بھیڑیا جو دھاری دار کتّے کی شکل کا ہوتا ہے گوشت خور ہیں۔ یہ بھیڑیا اب بہت کم ملتا ہے، چونکہ یہ بھیڑوں اور بکریوں کے بچّوں پر حملہ کرتا تھا، اِس لیے اوّلین آباد کاروں نے اِسے بہت جلدی مار کر ختم کر دیا۔

آسٹریلیا کے تمام جانوروں میں سے زیادہ عجیب پلیٹی پس ہے۔ اس کے تھیلی نہیں ہوتی اور جانوروں کے کسی کنبے سے نہیں ملتا جو آسٹریلیا یا دنیا میں اور جگہ پائے

جاتے ہیں۔ پلیٹی پس پانی کا جانور ہے اور اس کے اود بلاؤ کی طرح مخملی بال ہوتے ہیں۔ اس کی چونچ مرغابی کی طرح چپٹی ہوتی ہے۔ یہ انڈے دیتا ہے اور اپنے بچوں کو دودھ پلاتا ہے۔ کئی سال تک یہ بات پوری طرح ثابت نہ ہوسکی کہ یہ انڈے دینے والا جانور ہے۔ آخرکار برطانیہ کی انجمن ترقی سائنس نے ایک جانوروں کے ماہر کو صرف پلیٹی پس کی عادات معلوم کرنے کے لیے آسٹریلیا بھیجا۔ اس نے یہ بات معلوم کر لی کہ پلیٹی پس انڈے دیتا ہے۔ یہ خبر اس نے ایک بحری تار کے ذریعے سے اس انجمن کو بھیجی جو وہاں ایک ڈرامائی طریقے سے سائنس دانوں کی ایک جماعت کے سامنے سنائی گئی۔ پلیٹی پس آسٹریلیا کے جنوب مشرقی حصے میں دریاؤں اور دلدلوں میں رہتا ہے۔ یہ نہایت ڈرپوک ہے اور بہت کم دکھائی دیتا ہے۔ اب چونکہ اس کے پکڑنے کی ممانعت ہے اس لیے اب اس کی تعداد کافی ہو گئی ہے۔

ایکڈنا اِس ملک کا ایک اور عجیب جانور ہے جس کے بدن پر خار پشت کی طرح کانٹے ہوتے ہیں اور چیونٹیاں کھاتا ہے۔ یہ زیادہ کمیاب نہیں ہے اور اِس کے سوا کہ حفاظت کے لیے اس کی جلد میں کانٹے موجود ہیں یہ کسی اور بات میں خارپشت سے نہیں ملتا۔ یہ ایک لمبی فیتے جیسی زبان رکھتا ہے جس سے بڑی جلدی چیونٹیوں کو چاٹ جاتا ہے۔ یہ جانور انڈے دیتا ہے، اپنے بچوں کو دودھ پلاتا ہے اور انھیں تھیلی میں لیے پھرتا ہے۔ اگرچہ ایکڈنا اکثر جھاڑیوں میں نظر آجاتا ہے لیکن یہ انڈے دینے کے وقت بہت پوشیدہ جگہ تلاش کرتا ہے اور علم طبعیات کے تین چار ماہروں کے سوا اور کسی نے اِسے انڈے دیتے ہوئے نہیں دیکھا۔ اِسے پالا نہیں جا سکتا۔

پلیٹی پس اور ایکڈنا آسٹریلیا کے بہت ہی پرانے جانوروں میں سے ہیں۔ پہلے یہ خیال کیا جاتا تھا کہ شاید یہ جانور پرندوں اور رینگنے والے جانوروں کی درمیانی کڑی ہیں، لیکن اب یہ مانا جاتا ہے کہ ان کا مقام آج سے انیس کروڑ برس پہلے کے

زمانے کے دودھ پلانے والے اور رینگنے والے جانوروں اور دوسرے عام دودھ پلانے والے جانوروں کے درمیان تھا۔

آسٹریلیا کا صرف ایک ایسا جانور جو تھیلی رکھنے والے جانوروں کی قسم سے تعلق نہیں رکھتا، ڈنگویا ہے جو یہاں کا جنگلی کُتّا ہے۔ یہ بھُورا اور بعض اوقات بسکٹ جیسا رنگ رکھنے والا کتا، ایشیا یا یورپ کے بھیڑیئے نما کتوں سے ملتا جلتا ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ آسٹریلیا کے قدیم باشندے اسے یہاں لائے یا ایشیا سے آنے والے لوگوں کے ساتھ یہ اس برّ عظیم کے شمالی ساحل پر پہنچ گیا۔ یہ جنگلی کتا پہاڑوں اور میدانوں میں پایا جاتا ہے اور چھوٹے چھوٹے تھیلی دار جانوروں، خرگوشوں اور بکریوں کے چھوٹے بچّوں کا شکار کرتا ہے۔

یورپی لوگوں کے آسٹریلیا میں آجانے سے یہاں کے جنگلی جانوروں میں بھی اضافہ ہُوا۔ لومڑی اور خرگوش اب تمام برّاعظم میں پھیل گئے ہیں۔ جنوبی پہاڑوں میں ہرن بھی پائے جاتے ہیں۔ حال ہی میں یہاں سب سے آخری پہنچنے والا جانور بھورے رنگ کی گلہری ہے جسے دوسری جنگ عظیم کے دوران میں امریکا کے سپاہی یہاں لائے۔

پانچواں باب

پرندے اور رینگنے والے جانور

آسٹریلیا کا سب سے پہلا عجیب پرندہ ولندیزی قوم کے ایک شخص ڈی۔ ولمن نے دیکھا جو براعظم کے جنوب مغربی کونے کی دریافت میں مصروف تھا، یہ پرندہ ایک راج ہنس تھا جو سفید ہونے کے بجائے سیاہ رنگ کا تھا۔ مغربی آسٹریلیا کا یہ سیاہ رنگ کا راج ہنس بہت ہی خوبصورت پرندہ ہے۔ یہ سُرخ رنگ کی چونچ اور خالص سفید رنگ کے شہ پَر رکھتا ہے۔ علم طبیعیات کا مشہور ماہر ڈبلیو۔ ایچ ہڈسن اس کی خوبصورتی کی بہت تعریف کرتا ہے۔

زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ آسٹریلیا میں بہت سے اور عجیب و غریب پرندے بھی دریافت ہوئے۔ پرندوں کی کم از کم پانچ سو ایسی قسمیں ہیں جو دنیا میں کسی اور جگہ نہیں ملتیں۔ ان میں ساٹھ کے قریب مختلف قسم کے بڑی کلغی والے اور دوسرے توتے بھی شامل ہیں۔ چھوٹے بُوڈ برڈ یا بجّی کا وطن بھی آسٹریلیا ہی ہے۔ کلغی دار توتے عام توتوں سے اس بات میں مختلف ہیں کہ ان کے سر پر ایک تاج یا کلغی ہوتی ہے۔ اور جب بھی برانگیختہ ہوں، وہ اسے کھڑا کر سکتے ہیں۔ سفید اور زرد تاج والے کلغی دار توتے جو اکثر چڑیا گھروں میں دیکھے جاتے ہیں، آسٹریلیا ہی کے پرندے ہیں۔ ان کے علاوہ یہاں ایک سیاہ رنگ کا کلغی دار توتا بھی پایا جاتا ہے۔ یہ بہت بڑا پرندہ ہے اور جب یہ اپنے بازو پھیلائے تو اس کی چوڑائی چار فٹ کے قریب ہوتی ہے۔ یہ بہت بلندی پر اُڑتا ہے اور نہایت عجیب اور دلخراش آواز پیدا کرتا ہے۔ کہا جاتا

ہے کہ یہ پرندہ بارش لاتا ہے۔ جھاڑیوں والے علاقوں میں یہاں بہت سے چھوٹے چھوٹے خوبصورت اور سبز، سُرخ، پیلے اور نیلے رنگ کے مختلف اقسام کے توتے پائے جاتے ہیں ؛

توتوں کے علاوہ یہاں بہت سی قسموں کے کبوتر اور فاختہ کی قسم کے پرندے بھی ملتے ہیں۔ ان میں زیادہ چمکدار رنگوں والے پرندے برّاعظم کے شمالی حصّے میں پائے جاتے ہیں، بعض کبوتروں کے سُرخ رنگ کے تاج اور بعض کے اودی کلغی ہوتی ہے۔ یہ میوہ خور ہیں۔ کچھ ایسے کبوتر بھی ملتے ہیں جن کے جسم پر سیاہ رنگ کی دھاریاں ہوتی ہیں۔ ایک اَور ایسی قسم بھی ہے جس کا سینہ اودے رنگ کا ہوتا ہے اسے وومپو کہتے ہیں۔ کبوتروں کے اس گروہ میں سب سے زیادہ عجیب کانسی جیسے رنگ کے پروں والا ایک کبوتر ہے جو جس وقت اڑتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے پَروں میں چھوٹے چھوٹے شگاف یا کھڑکیاں ہیں۔ اِس بات کا دھوکا اِس وجہ سے ہوتا ہے کہ اِس کے پَروں میں قوسِ قزح کی طرح کئی اور رنگ بھی موجود ہیں۔

ایک اور عجیب پرندہ لائیر برڈ یا بربط پرندہ کہلاتا ہے۔ اسے یہ نام اس لیے دیا گیا ہے کہ اس کی لانبی دُم میں بہت سے پَر ہوتے ہیں اور جب یہ اُن کو اونچا کرتا ہے تو وہ بربط کی طرح دکھائی دیتے ہیں۔ یہ پرندہ جنگلوں اور گھاٹیوں میں پایا جاتا ہے اور بہت شرمیلا ہے۔ اس میں ہر قسم کی آوازوں کی نقل اتارنے کی عجیب و غریب صلاحیت ہے۔ جب بھی چاہے یہ ایک زخمی جانور کی درد ناک آواز، کسی بیل گاڑی کے پہیوں کی چوں چوں اور بعض دفعہ ایسی آواز پیدا کرتا ہے جو لکڑہارا کاٹتے وقت پیدا ہوتی ہے۔ جب کوئی انسان یا پرندہ اس کے گھونسلے کے قریب جانے کی کوشش کرے تو یہ اُس کو ڈرانے کے لیے اِس قسم کی آوازیں نکالتا ہے۔ انڈے سینے کے موسم میں لائیر برڈ مٹی کا ایک چھوٹا سا ٹیلا بناتا ہے اور اُس پر

عجیب و غریب انداز سے ناچتا ہے۔ دیکھنے والے بتاتے ہیں کہ ناچ کے وقت اس کی حرکات ایک ماہرفن رقاصہ سے ملتی ہیں۔

ایک اور ناچنے والا پرندہ بوور برڈ کہلاتا ہے۔ یہ بھی بہت شرمیلا پرندہ ہے۔ شروع میں اس کا رنگ زردی مائل سبز ہوتا ہے، لیکن سات سال کی عمر ہونے پر یہ گہرے نیلے رنگ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ یہ پرندہ ٹہنیوں کا ایک چھوٹا سا گھونسلا بناتا ہے۔ اس غرض کے لیے یہ اکثر سبز اور نیلے رنگ کی چیزیں جمع کرتا ہے اور کبھی کبھی اس رنگ کے پھول بھی اکٹھے کرکے اپنے گھونسلے کے ارد گرد رکھ لیتا ہے۔ اس کے بعد مادہ کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے یہ ایک دل کش رقص کرتا ہے اور دوڑتا ہُوا بار بار گھونسلے کے اندر اور باہر جاتا ہے۔

کنگ فشر یا ماہی خور پرندوں کی بھی بہت سی قسمیں پائی جاتی ہیں۔ جن کے پر نہایت خوبصورت ہوتے ہیں۔ یہ پرندے شمالی اور وسطی آسٹریلیا کے دُور دراز خشک دریاؤں کے اُوپر اُڑتے رہتے ہیں۔ آسٹریلیا کا سب سے عمدہ اور دل لبھانے والا پرندہ کوکا بُورا یا ہنسنے والا جاکاس ہے۔ یہ بھی مچھلی کا شکار کرنے والے پرندوں کی ایک قسم سے ہے۔ اس کی کلغی اور پَر بھورے رنگ کی اور چونچ بہت مضبوط ہوتی ہے۔ کوکا بورا انسان سے بھی نہیں ڈرتا اور اکثر کھیتوں میں جب انسان ہل چلاتے ہوں تو اُن کے پیچھے تازہ کُھدی ہوئی زمین میں سے کیڑے مکوڑے نکالتا ہُوا دکھائی دیتا ہے اور گھوڑوں کے قریب پہنچ جانے سے بھی نہیں ہچکچاتا۔ یہ صبح اور شام کے وقت درختوں کی ٹہنیوں پر بیٹھا ہُوا ملتا ہے اور بہت زور زور سے ہنسنے کی آواز پیدا کرتا ہے۔ اسی وجہ سے اس کو "مرغِ خنداں" کہتے ہیں۔

ایک اور پرندہ جسے آسٹریلیا میں نشان کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے، ایمو ہے۔ یہ شتر مُرغ کے بعد دنیا کا سب سے بڑا پرندہ ہے۔ پہلے ایمو آسٹریلیا کے

ہر علاقے میں پایا جاتا تھا لیکن اب یہ صرف اندرونی حصّے ہی میں ملتا ہے ۔ جنوبی امریکا کے بڑے پرندے ری ہا کی طرح یہ بھی صرف دوڑنے والا پرندہ ہے ۔ اس میں اُڑنے کی طاقت نہیں ہے ۔ چونکہ یہ باڑوں کو توڑ دیتا ہے اور گندم کی فصلوں کو تباہ کرتا ہے اور گھاس کھا جاتا ہے اس لیے کسان اور چرواہے جہاں بھی اس کا گھونسلا یا اس کے سبز رنگ کے انڈے دیکھتے ہیں انھیں فوراً تباہ کر دیتے ہیں ۔

ایک اور بڑا پرندہ کاسوواری ہے جو یہاں شمالی منطقۂ حارہ کے جنگلوں میں پایا جاتا ہے ۔ اس کے پاؤں بہت مضبوط ہوتے ہیں اور سر بھی لوہے کے خود کی طرح سخت ہوتا ہے ۔ اگرچہ یہ ڈرپوک ہے، لیکن بڑا طاقتور اور لڑاکا بھی ہے ۔ اگر اسے تنگ کیا جائے تو نہتے آدمی کے لیے اس کا مقابلہ کرنا مشکل ہے ۔ ایمو اور کاسوواری اپنے گھونسلے کے لیے مٹی کا ٹیلا بناتے ہیں اور یہاں مٹی اور پتّوں کے ڈھیر میں انڈے دیتے ہیں ۔ نر انڈوں پر بیٹھتا ہے ۔ اسی قسم کا گھونسلا بنانے والے اور جانور جھاڑیوں میں رہنے والا فیل مرغ اور مالی ہیں جو ریگستانی علاقوں میں پائے جاتے ہیں ۔ یہ اپنے انڈے زمین پر پتوں میں رکھ دیتے ہیں جن سے قدرتی حرارت کے ذریعے سے از خود بچّے نکل آتے ہیں ۔ شمال میں ایک اور چھوٹا پرندہ بھی پایا جاتا ہے جسے جھاڑی پرندہ کہتے ہیں ۔ یہ اپنے گھونسلے کے لیے ستّر فٹ چوڑا ٹیلا بناتا ہے اور انڈوں کو ڈھانپنے کے لیے مختلف چیزیں استعمال کرتا ہے جن سے انھیں ضرورت کے مطابق حرارت ملتی رہے ۔

آسٹریلیا میں بہت سے شکاری پرندے بھی پائے جاتے ہیں، لیکن اب تک گد اور کرگس یہاں نہیں پہنچے ، تاہم آسٹریلیا کے دیسی شکرے ، باز، چیلیں اور شاہین بکثرت ملتے ہیں، لیکن یہ سب کے سب دنیا کے دوسرے ملکوں سے مختلف ہیں ۔ آسٹریلیا کا ویج ٹیل دنیا کا سب سے بڑا عقاب ہے ۔ یہ سیاہ رنگ کا پرندہ اتنا بڑا ہے کہ جب یہ اپنے پَر پھیلائے تو اس کی چوڑائی آٹھ فٹ کے قریب ہوتی ہے ۔ عام قسم

کے اُلّو بھی آسٹریلیا میں پائے جاتے ہیں، لیکن بُوبک یا مُوکپوک اُلّو دوسروں سے بہت مختلف ہیں ۔ مُوکپوک اُلّو کا یہ نام اس کی غمگین آواز کی وجہ سے رکھا گیا ہے۔

دلدلوں میں رہنے والے آبی پرندے جن میں ریل، کریک، مرغابیاں اور گریبز شامل ہیں یہاں بکثرت پائے جاتے ہیں ۔ سفید کلغی والے گریب اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کو اپنے اوپر اٹھائے پھرتے ہیں ۔ سمندری پرندے جن میں پیٹرلز، لینڈ ریلز، آوسیٹس، ٹرنز، سکاس اور البیٹرس قسم کی سمندری ابابیلیں اور مرغابیاں بھی شامل ہیں، بکثرت پائی جاتی ہیں، لیکن یہ نصف کرۂ جنوبی کے دوسرے علاقوں والے ہم جنسوں سے مختلف نہیں ہیں ۔

چھوٹے پرندوں میں سے جو کہ جنگل کے کناروں پر جھاڑیوں میں یا دلدلی زمین پر پائے جاتے ہیں، بے شمار عجیب قسموں کے پرندے ہیں ۔ ان میں نہایت خوبصورت رنگوں کے رنز، فلائی کیچرز، تھارن بلز اور نازک اور چھوٹے ہنی ایٹرز، فین ٹیلز اور سُرخ سیاہ اور سفید ابابیلیں، واربلرز، پیٹاز اور بہت سی قسموں کے فنچ اور تھرشز شامل ہیں۔

جنگلوں کے کناروں پر کھلی چراگاہوں میں رہنے والے پرندے عام طور پر سیاہ اور سفید رنگ کے ہیں ۔ کوّے، پہاڑی کوّے، وگ ٹیلز اور میگ پائیز ان میں شامل ہیں۔ ان میں سے اکثر نہایت عجیب سیٹی کی آواز نکالتے ہیں اور گاتے ہیں ۔ خاص طور پر بلیک شرائیک کو اس کے سُریلے گانے کی وجہ سے آسٹریلیا کے لوگ میگ پائیز یا مینا کہتے ہیں ۔ یہ بہت ہی بے تکلف نقّال ہے اور انسانی آواز اور سیٹی کی فوراً نقل کر لیتا ہے، البتہ انسان اس کی نرم اور سریلی آواز کی نقل نہیں کر سکتا۔

آسٹریلیا کے ناپسندیدہ جانوروں میں صرف یہاں کے سانپ اور مگرمچھ ہیں ۔ یہ مگرمچھ اُن دیو قامت مگرمچھوں کی نسل سے ہیں جو قدیم زمانے میں برّاعظم کے اندرونی سمندر کے ساحلوں پر رہتے تھے اور اب یہ شمالی دریاؤں، دلدلوں اور جھاڑیوں میں پائے

جاتے ہیں - یہ اکثر انسان کو تکلیف نہیں دیتے - سانپ تقریباً ہر جگہ ملتے ہیں اور ہر تین میں سے دو زہریلے ہوتے ہیں - آہستہ چلنے والا سیاہ رنگ کا ایڈر سانپ جو چپ چاپ لیٹا رہتا ہے اور اگر اس کی طرف کوئی بڑھے تو بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلتا - پیچھے ہٹ کر فولادی سپرنگ کی طرح جھپٹتا ہے اور اس کا زہر ہندوستان کے ناگ سے بھی زیادہ مہلک ہے - اس کے کاٹنے کے بعد پانچ منٹ کے اندر انسان مرجاتا ہے - تیزی سے چلنے والا ٹائیگر سانپ جسے یہ نام اس کی' بھورے رنگ کی' دھاریوں کی وجہ سے دیا گیا ہے بہت تیزی سے حملہ آور ہوتا ہے - یہ پانچ سے چھ فٹ تک لمبا ہوتا ہے - یہ نہایت زہریلا ہے - آسٹریلیا میں سیاہ رنگ کے سانپ، بھورے رنگ کے کوپر ہیڈز، کورل سانپ، اور سبز رنگ کے زہریلے پانی کے سانپ بھی پائے جاتے ہیں - ان میں سے آخری قسم کے سانپ زیادہ تر شمال میں ملتے ہیں -

اُن سانپوں میں سے جو زہریلے نہیں ہوتے کچھ بڑے خوبصورت کارپٹ اور ڈائمنڈ سانپ ہیں جن کو یہ نام اُن کی جلد کی ساخت اور وضع کے اعتبار سے دیے گئے ہیں - یہ دس فٹ تک لمبے ہوتے ہیں - ایک زمانے میں ان کی بڑی مانگ تھی، کیونکہ ان کی کھال سے عورتوں کے خوبصورت جوتے تیار کیے جاتے تھے - بعض اوقات یہ سانپ پکڑ کر منڈیوں میں بلیوں اور کتوں کی طرح بیچے جاتے ہیں اور ان کی مدد سے چوہوں کو بڑھنے سے روکا جاتا ہے - شمالی آسٹریلیا میں ایک ایسا اژدہا بھی پایا جاتا ہے جو بیس فٹ تک لمبا ہوتا ہے، لیکن اب یہ بہت کم نظر آتا ہے -

یہاں کچھ عجیب قسم کی چھپکلیاں بھی ہوتی ہیں - خشک زمینوں پر "گوانا" تیز دوڑنے والی چھپکلی عام دیکھی جاتی ہے جو اپنی دُم درختوں پر بہت تیزی سے مارتی ہے - کچھ بغیر دُم کی چھپکلیاں بھی پائی جاتی ہیں جو بالکل سانپ کے مانند دکھائی دیتی ہیں - ان میں سے کچھ بہت سخت جان ہوتی ہیں جو اپنے سر کو ڈنڈے کی طرح دوسری

چیزوں پر مارتی ہیں - ایسی بے دُم چھپکلیاں بھی ہیں جو کتے کی طرح بھونکتی ہیں۔ایک اور چھوٹی قسم کی چھپکلی ہے جو بھارنی ڈیول کہلاتی ہے۔ یہ حضرت نوحؑ کے طوفان سے پہلے کے کسی اژدھے کا ایک چھوٹا نمونہ معلوم ہوتی ہے۔

چھٹا باب

ساحلی چٹانیں اور جوار بھاٹا

آسٹریلیا کے گرد و نواح کے سمندروں میں ہر قسم کے جاندار بڑی کثرت سے موجود ہیں۔ بحرِ جنوبی میں وھیل مچھلی بکثرت پائی جاتی ہے اور انیسویں صدی کے شروع میں میساچوسٹس کے وھیل مچھلی پکڑنے والے جہاز جنوبی آسٹریلیا کی بندرگاہوں اور خلیجوں میں پہنچ کر ان کا شکار کیا کرتے تھے۔ تسمانیا کے گرد و نواح کے چٹانی جزیروں کے آس پاس سیل بھی پائی جاتی ہے، ان کو پکڑنے کے لیے عرصے تک شکاری یہاں آتے تھے اور ان کا اس قدر شکار کیا گیا کہ ایک موقع پر ان کے ناپید ہو جانے کا خطرہ ہو گیا تھا۔

آسٹریلیا کے سمندروں میں نوّے قسم کی مختلف شارک مچھلیاں ملتی ہیں۔ ان میں سے ٹائیگر شارک کی لمبائی پچاس فٹ تک ہوتی ہے۔ بھورے رنگ کی نرس شارک جو آسٹریلیا کے ساحل کے قریب پائی جاتی ہے سمندر میں نہانے والوں کے لیے سخت خطرناک ہے۔ ہر سال سمندر میں تیرنے والے بہت سے افراد اس مچھلی کا لقمہ بن جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ سٹنگریز، الیکٹرک ریز اور ڈیول ریز کی قسم کی بہت سی مچھلیاں بھی سخت خطرناک ہیں۔ یہ پانی کی تہ میں چپت لیٹی رہتی ہیں اور ایک خنجر جیسے کانٹے سے جو کہ ان کی دُم میں چھپا ہوتا ہے، حملہ کرتی ہیں۔

فلونڈرز، سولز، میکیرل اور جان ڈوریز کی قسم کی مچھلیاں خوراک کے لیے بہت عمدہ خیال کی جاتی ہیں۔ انھیں ساحل کے قریب جہازوں اور کشتیوں میں بیٹھ کر جال سے پکڑا جاتا ہے۔ دھاری دار مارلن کی قسم کی سپورٹنگ فش بھی کثرت سے ملتی ہیں۔ یہ

پندرہ فٹ تک لمبی ہوتی ہیں۔ سورڈ فش ٹینیز اور واہو قسم کی مچھلیاں شکاریوں کو بالخصوص مرغوب ہیں۔

یہاں کی غیر معمولی مچھلیوں میں چونچ دار سامن مچھلی یا سینڈ سامن مچھلی ہے، جس کی نوک دار تھوتھنی، منہ چھوٹا اور جسم لمبا ہوتا ہے۔ اِس کے جسم پر چھوٹے چھوٹے چھلکے ہوتے ہیں۔ سینڈ سامن پانی کے نیچے ریت میں دھنس جاتی ہے اور پھر خوراک حاصل کرنے کے لیے سیدھی اوپر کو اُٹھ آتی ہے۔ آسٹریلیا کی لونگ ٹوم ایک گارفِش کی قسم کی مچھلی ہے جس کا سبز رنگ کا جسم، سانپ کی طرح لمبا ہوتا ہے۔ اس کے دونوں جبڑے اتنے لمبے ہیں کہ چونچ معلوم ہوتے ہیں۔ اس کے منہ میں سُوئیوں کی طرح سیدھے دانت ہوتے ہیں۔ یہ مچھلی عام طور پر سطحِ بحر کے قریب ہی رہتی ہے اور پانی سے باہر اُچھلتی ہوئی بھی دکھائی دیتی ہے۔ آسٹریلیا کی زندہ حیاتی نشانیوں کی قسم میں سے کوئینز لینڈ لنگ فِش ہے جو کوئینز لینڈ کے دریاؤں میں پائی جاتی ہے۔ گلپھڑوں کے ذریعے سے سانس لینے کے بجائے اس مچھلی کے پھیپھڑے ہوتے ہیں۔ سائنس داں ابھی تک اس کے متعلق یہ فیصلہ نہیں کر سکے کہ اسے دودھ پلانے والا جانور تسلیم کیا جائے یا مچھلی سمجھا جائے۔

ساحل کے قریب چٹانی جھیلوں کے کناروں پر بے شمار خوبصورت پودے دکھائی دیتے ہیں اور ریتیلے ساحل پر طرح طرح کے گھونگے اور سیپیاں ملتی ہیں۔ بعض گھونگے بہت ہی خوبصورت ہوتے ہیں اور انھیں جمع کرنے والے ان کی بہت زیادہ قیمت دینے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ مدّ و جزر کی لہروں میں ساڑھے چار سو سے زیادہ قسم کے سمندری خار پشت اور چوہے وغیرہ دیکھے گئے ہیں۔ یہاں کلامز، مسلز، سکاپس اور اوسٹر بھی بکثرت پیدا ہوتے ہیں۔ نیو ساوتھ ویلز کے اوسٹر جو سڈنی کے قریب کے ساحل پر پائے جاتے ہیں بہت لذیذ سمجھے جاتے ہیں۔

مونگے کی وہ بڑی دیوار جو مشرقی ساحل کے شمالی کونے کے ساتھ بارہ سو میل تک

پھیلی ہے بحری جانوروں کی بہت بڑی پناہ گاہ ہے۔ یہ مونگے کی دیوار سمندر کی تہ سے ایک سو بیس فٹ تک بلند ہے اور بعض جگہ ایک میل تک چوڑی ہے۔ ساحلِ سمندر سے اس کا فاصلہ مختلف جگہوں پر سو سے دو سو میل تک ہے۔ اس مونگے کی دیوار کے اِرد گِرد بہت شاندار اور دنیا کی نہایت غیر معمولی مچھلیاں پائی جاتی ہیں۔ یہاں بیبز فِش، زرد نشانوں والی لیدر جیکٹس، نیلی اور سبز ڈی موائزیلیز، چونچ دار کورل فِش، عجیب شکل والی بٹرفلائی کاڈ، بلیو باٹل فِش، فائیل فِش، گرنارڈز، ٹوڈوز، ربن فِش، ایلز، بیرومیٹر کیکڑے، کورل کرے فِش، سٹرائیز اور بلینیز کی مختلف قسموں کی مچھلیاں ملتی ہیں۔ یہاں مختلف رنگوں، مختلف شکلوں اور مختلف جسامت کے مونگے پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے برین کورل، سٹیگ ہارن کورل، مشروم کورل اور روزی کورل یہاں کی عام قسمیں ہیں۔

بڑے بڑے سمندری "جاندار" پودے جن میں سے بعض تین تین اور چار چار فٹ چوڑے ہوتے ہیں سمندر کی لہروں میں اپنی شاخیں پھیلائے ہوئے ملتے ہیں اور بہت سے کثیر پا جانور اور بے شمار رنگوں کی جیلی فِش پانی میں تیرتی ہوئی پائی جاتی ہیں۔ بڑے بڑے گھونگے جن میں سے بعض ایک گز چوڑے ہوتے ہیں مونگے کی جڑوں کو پکڑنے کا کام دیتے ہیں۔ بہت سی ٹانگیں رکھنے والے تیندوے سمندر کے گہرے غاروں میں سے نکل کر مونگے میں اِدھر اُدھر گھومتے پھرتے ہیں، اور جس رنگ کے مونگے کے پاس سے گزرتے ہیں وہی رنگ اختیار کر لیتے ہیں۔ یہاں کھانے کی پلیٹ کے برابر بڑی بڑی سیپیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ جن میں سے بعض دفعہ ایک سیپ میں سے ہی ہزاروں روپے کی مالیت کے موتی حاصل ہو جاتے ہیں۔ بڑے بڑے سُست رفتار سبز رنگ کے کچھوے پانی کے نیچے ریت پر رینگتے رہتے ہیں۔

مونگے کی یہ بڑی دیوار ایک ایسی جگہ ہے جہاں علمِ طبیعیات کے ماہروں کو مطالعہ کے لیے بے شمار چیزیں مل سکتی ہیں۔ دنیا میں کسی اور جگہ اس قدر مونگے ایک جگہ اکٹھے نہ پائے

جاتے ہوں گے اور سمندری جانوروں کے مشاہدے کا موقع بھی یہاں سے زیادہ اور کہیں نہیں مل سکتا۔ علم طبیعیات کے ماہر پانی کے اندر پہننے کے چشمے لگا کر اور سانس لینے کا آلہ پہن کر اس جگہ مونگے کے چھوٹے چھوٹے تالابوں میں اُتر جاتے ہیں اور یہاں کے زندہ جانوروں کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ ان سمندروں میں ایک نہ ختم ہونے والی زندگی کی کشمکش ہر وقت جاری رہتی ہے۔ سٹار فش اپنے بازوؤں سے سیل فش کو جکڑ لیتی ہے۔ اور گھونگے ان دونوں کو اپنے قبضے میں لے لیتے ہیں۔ سیناٹور فش، پکرل کو کھا جاتی ہے۔ اور ایک بڑا سمندری زندہ پودا اپنے ریشمی بازو ان دونوں کے گرد لپیٹ دیتا ہے۔

آسٹریلیا کے شمالی ساحل کے قریب خاص طور پر کیپ یارک اور نیوگنی کے درمیان آبنائے ٹوریز میں موتی حاصل کرنے کا کام بڑے پیمانے پر ہوتا ہے۔ اس تجارت کی بڑی منڈیاں خلیج کارپنٹریا میں تھرس ڈے آئی لینڈ پر اور ساحل پر ڈارون اور بروم میں قائم ہیں۔ موتی حاصل کرنے والے چھوٹے چھوٹے بادبانی جہاز اپنے سازو سامان سے لیس ہو کر یہاں سے ساحل کے ساتھ ساتھ ان کم گہرے سمندروں میں پہنچتے ہیں، جہاں موتی والی سیپیاں ملتی ہیں۔ یہ کام زیادہ تر ملایا اور جاپان کے لوگ کرتے ہیں۔ اس کام کے لیے غوطہ زن پانی میں اتر جاتے ہیں اور کئی منٹوں تک سمندر کی تہ میں رہ کر سیپوں کو اپنے تھیلوں میں بھر کر اوپر لے آتے ہیں۔ بناوٹی موتیوں کی وجہ سے اس صنعت کو بڑا نقصان پہنچا ہے، لیکن اب بھی بٹن وغیرہ تیار کرنے کے لیے سیپ کی مانگ ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ یکایک ایک بڑی قیمت کا موتی حاصل ہو جاتا ہے۔ "سٹار آو دی ویسٹ" مشہور موتی جس کا وزن ایک سو گرین تھا اور جس کی قیمت ڈیڑھ لاکھ روپے سے زیادہ ہے اسی طرح حاصل ہوا تھا۔

ساتواں باب

بُونیپ اور بُومرانگ

سفید فام لوگوں کے آنے سے بہت پہلے آسٹریلیا میں سیاہ رنگ کے لوگ رہتے تھے۔ پہلے ان کو انڈین خیال کیا گیا اور پھر اُن کو حبشی یا صرف سیاہ لوگ کہا جانے لگا۔ اب بھی یہ لوگ اسی نام سے پکارے جاتے ہیں۔ شروع میں تحقیق کرنے والوں نے اس بات کی کوشش کی کہ شاید ان کی زبان دوسرے قدیم لوگوں کے ساتھ ملتی ہو، لیکن اس میں کوئی کامیابی نہ ہوئی، بعد میں ماہرانِ عمرانیات اس نتیجے پر پہنچے کہ ان کا تعلق اُس نسل کے حبشی لوگوں سے ہے جو کسی زمانے میں وسط ایشیا اور ملایا سے یہاں پہنچے۔ عام حبشی نسل کے لوگوں سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ نہایت قدیم زمانے میں جب برّاعظم آسٹریلیا جزائرِ شرق الہند کے ساتھ ملا ہوا تھا یہ لوگ یہاں پہنچے۔ اس وقت بھی اسی بات کو کسی حد تک مانا جاتا ہے، لیکن اب بعض محقق ان کو ایک علیحدہ نسل کے لوگ تصور کرنے لگے ہیں اور ان کے لیے آسٹرا لائیڈز یعنی آسٹریلیا کے خاص حبشی لوگوں کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔

یہ لوگ دو گروہوں میں منقسم ہیں اور یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ دو مختلف موقعوں پر یہاں آئے۔ پہلے گروہ کے لوگ برّاعظم کے جنوبی حصّے میں اور جزیرہ تسمانیا میں رہتے ہیں۔ شاید بعد میں آنے والوں نے ان کو ڈھکیل کر یہاں پہنچا دیا۔ ان کے بال گھونگھریالے ہوتے ہیں۔ اور چند اور باتوں میں اور خاص طور پر رہنے سہنے کے طریقوں میں شمالی حصّے کے لوگوں سے مختلف ہیں۔ جنوبی حصّے کے یہ قدیم باشندے پتھّر کے ہتھیار

استعمال کرتے تھے، لیکن انھیں، ان کو صیقل کرنے کا فن معلوم نہ تھا۔ برِاعظم کے دوسرے قدیم باشندے ہتھیاروں پر صیقل کرنا جانتے تھے۔

تسمانیا کے رہنے والے قدیم باشندے، اگرچہ ایسی جگہ رہتے تھے، جسے دو سو میل چوڑا طوفانی سمندر برِاعظم آسٹریلیا سے علیحدہ کرتا تھا، لیکن بظاہر انھیں جہاز رانی کا فن معلوم نہ تھا۔ کوئی شخص ٹھیک طور پر یہ نہیں بتا سکتا کہ وہ اس جزیرے پر کب سے رہتے تھے۔ لیکن صدفوں کے خولوں کے ڈھیروں سے جو اُن کے جھونپڑوں کے قریب پائے جاتے ہیں، یہ اندازہ کیا جاتا ہے کہ وہ تیس ہزار سال پرانے ہیں۔ جب سفید لوگ یہاں پہنچے تو تسمانیا میں ان قدیم باشندوں کی تعداد تین یا چار ہزار سال سے زیادہ نہ ہوگی۔ چونکہ اس بات کا شک کیا جاتا تھا کہ وہ سفید لوگوں کی بھیڑیں چرا کر لے جاتے ہیں اور انھیں لوٹنے کی کوشش کرتے ہیں اس لیے اکثر اُن پر حملہ کرکے اُن میں سے بہتوں کو مار دیا جاتا تھا۔ ایک موقع پر جزیرے کا ایک بہت بڑا حصّہ اس طرح مار مار کر ان سے خالی کر دیا گیا۔ لیکن یہ قدیم باشندے بڑے ہوشیار اور چالاک تھے۔ ایک دفعہ جب ان کے ایک بہت بڑے گروہ کے گرد گھیرا ڈالا گیا تو آخرکار اس کے اندر صرف ایک بوڑھی عورت اور ایک بچّہ پایا گیا اور باقی سب بڑی ہوشیاری سے اس میں سے نکل کر بھاگنے میں کامیاب ہو گئے۔

ایک اور موقع پر تصویر دار اشتہاروں کے ذریعے سے اُن کو تعلیم دینے کی کوشش کی گئی۔ ایک تصویر میں ایک سفید عورت کو دکھایا گیا، جس کی گود میں ایک سیاہ نسل کا بچّہ تھا۔ اور ایک سیاہ عورت کو ایک سفید بچّے کے ساتھ دکھایا گیا جس سے ان کے درمیان دوستی ظاہر ہو۔ اس کے ساتھ ہی ایک دوسری تصویر میں، ایک سیاہ نسل کے مرد کو ایک بھیڑ کو نیزے سے مارتے ہوئے دکھایا گیا اور پھر ایک سیاہ نسل کے آدمی کو پھانسی دیتے ہوئے دکھایا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے بعد یہاں کے قدیم باشندوں کا ایک گروہ اپنے میں سے ایک شخص کو سفید لوگوں کے پاس لایا اور

کہا کہ اسے پھانسی دی جائے۔ اس لیے نہیں کہ اس نے کسی بھیڑ کو مارا تھا بلکہ اس لیے کہ وہ یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ سفید آدمی کس طرح پھانسی دیتے ہیں۔

ایک موقع پر سفید لوگوں اور تسمانیا کے سیاہ لوگوں کے درمیان کشمکش اس حد تک پہنچ گئی کہ وہاں کے سفید لوگوں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ اُن کو قریب کے دوسرے جزیروں پر آباد کر دیں۔ وہ اس قید میں زیادہ عرصے تک زندہ نہ رہ سکے۔ حال ہی میں جب انسانی نسل کے ماہر اس نتیجے پر پہنچے کہ تسمانیا کے قدیم باشندے بہت غیر معمولی لوگ ہیں تو پتا چلا کہ ان کی نسل کا صرف ایک شخص زندہ موجود ہے۔ اس کا نام ٹروکانینی تھا اور یہ قد آور اور سیاہ فام آدمی وھیل مچھلی پکڑنے والے جہازوں کے ایک بیڑے میں نیزہ مارنے کے کام پر ملازم تھا۔ ۱۸۷۶ء میں ایک دن یہ بیڑا ہوبارٹ کی بندرگاہ میں واپس آیا۔ ٹروکانینی خشکی پر پہنچا اور شراب خوری میں مصروف ہو کر مر گیا۔ اس طرح تسمانیا کا پتھر کے زمانے کا آخری شخص بھی چل بسا۔

برّاعظم پر رہنے والے قدیم باشندوں کے بال سیدھے ہوتے ہیں اور یہ ڈاڑھیاں بھی رکھتے ہیں۔ یہ بھی پتھر کے زمانے کے لوگ ہیں لیکن ان کے ہتھیار اور اوزار بہتر ہیں۔ بومرینگ اِنھی لوگوں کی ایجاد ہے۔ یہ جٹ بلین کی طرح ٹیڑھے کناروں والی ایک لکڑی ہوتی ہے، جسے پھینکا جائے تو اگر یہ اپنے نشانے پر نہ پہنچے تو چکر کھا کر پھینکنے والے کے پاس واپس آ جائے گی۔ ان میں سے بعض قبیلے پتّوں اور درختوں کی چھال کے بنائے ہوئے جھونپڑوں میں رہتے ہیں، جنھیں یہ میامیاز کہتے ہیں، لیکن یہ لوگ زیادہ تر خانہ بدوش تھے اور بغیر کسی پناہ کے زندگی بسر کرتے تھے۔ یہ کپڑے بھی نہیں پہنتے تھے۔ اس جھاڑیوں والے ملک کے متعلق اُن کی واقفیت بہت زیادہ تھی اور یہ خشک زمین پر کسی انسان یا جانور کے گزرنے کے نشان کو اُس کے جانے کے ہفتوں بعد تک بھی دیکھ کر اس کا پیچھا کر سکتے تھے۔ اس غرض کے لیے اکثر سفید

لوگ اپنے کھوئے ہوئے ساتھیوں اور جانوروں کے ڈھونڈنے میں ان سے مدد لیتے تھے۔ یہ لوگ لکڑی کے دو ٹکڑوں کو آپس میں رگڑ کر آگ پیدا کرتے تھے، لیکن وہ پکا ہوا کھانا نہیں کھاتے تھے۔ اُن کی خوراک زیادہ تر جنگلی جانور، سانپ، کیڑے مکوڑے اور پرندے ہوتے تھے۔ یہ لوگ ہر چیز کی نقل اتارنے میں بڑے ماہر تھے اور جب بھی ان کے قبیلوں کا ناچ یا جشن ہوتا تو یہ ایمو، کنگرو اور دوسرے جانوروں کی نہایت عمدہ نقل اتارتے۔ ان کے قصّے، کہانیاں اور روایات نہایت پرانی قسم کے لوگوں کی سی ہیں۔ یہ نہایت ہی عجیب رسمیں ادا کرتے تھے اور یہ خیال کیا جاتا تھا کہ قبیلوں کے سرداروں کے پاس بہت سی راز کی باتیں محفوظ ہیں۔ ان کو پودوں کے بیجوں کے متعلق کوئی واقفیت نہ تھی اور اس وجہ سے وہ کاشتکاری کا علم نہ جانتے تھے۔ جب بھی کوئی شخص ان میں سے مرتا تھا تو وہ ہمیشہ یہی خیال کرتے تھے کہ وہ کسی بری روح کے آسیب سے مرا ہے یا قبیلے کے کسی دوسرے شخص نے جادو کے زور سے اسے مار ڈالا ہے۔

ان لوگوں کے حالات کا مشاہدہ کرنے والے بعض سفید لوگوں نے ان کی قدیم روایات اور فرضی کہانیوں کو لکھا ہے۔ یہ کہانیاں زیادہ تر پُراسرار پانی کے چشموں اور تالابوں کے متعلق ہیں۔ ان کے اعتقاد کے مطابق دریا کی ایک روح جسے نبیب کہتے ہیں پانی کے چشموں میں سے باہر نکلتی ہے اور انسانوں کو مار ڈالتی ہے۔ انسانی نسل کے کچھ ماہروں نے بتایا ہے کہ یہ کہانیاں ان لوگوں کی پرانی یادوں کے متعلق ہیں جب بہت بڑے بڑے مگرمچھ اندرونی سمندر میں رہتے تھے، لیکن اس قسم کے تصوّر کی وجہ شاید یہ نہیں ہے۔ یہ ایک معمولی بات ہے کہ ایک ایسے ملک میں جہاں زمین نہایت خشک ہو پانی زندگی کے لیے نہ صرف بہت اہم ہے بلکہ اسے ایک پُراسرار اور طاقتور چیز بھی سمجھا جانا ضروری ہے۔ ساحل کے قریب کھارے پانی کی جھیلوں میں

پانی بالکل خاموش رہتا ہے اور اس کی ہموار سطح میں نیلے آسمان کا عکس صاف دکھائی دیتا ہے اور ان کے کناروں پر کئی جگہ درختوں کی قطاریں نظر آتی ہیں جن کی نیچے کو جھکی ہوئی ٹہنیاں اور پتے دور سے بالکل انسانی شکل کے مشابہ ہیں۔ ان درختوں کو کاٹا جائے تو ان میں سے خون جیسا سرخ رس بھی نکلتا ہے۔

سفید فام لوگوں کے آنے سے یہاں کے قدیم باشندوں کے قبیلوں کی زندگی ختم ہو گئی۔ نہ صرف یہ کہ وہ میدان جن میں وہ شکار کیا کرتے تھے اُن سے چھن گئے بلکہ خود ان کا شکار ہونے لگا۔ اس کے علاوہ وہ ان بیماریوں میں بھی مبتلا ہونے لگے جو سفید فام لوگ ان کے لیے یہاں لائے۔ ٹپ دق اور دوسری بہت سی بیماریوں سے ان کے کافی آدمی مر گئے۔ ایک دفعہ ان کے بہت سے قبیلے ایک ہی مرض سے ختم ہو گئے۔ جسے پہلے یہ خیال کیا گیا کہ وہ چیچک کا مرض تھا، لیکن شاید وہ چیچک کے بجائے صرف خسرہ کی بیماری ہی سے اس قدر جلدی مر گئے، کیونکہ اُن میں اس کی مدافعت کی طاقت نہ تھی۔ بہت سے آدمی شراب خوری سے بھی مر گئے۔

اس وقت آسٹریلیا میں تقریباً ساٹھ ہزار کے قریب قدیم باشندے باقی ہیں۔ یہ بڑے شہروں کے قریب نہیں رہتے۔ وہ رہن سہن کے موجودہ طرز کو پسند نہیں کرتے۔ ان میں سے کچھ ملک کے اندرونی حصّے کے بھیڑوں کے باڑوں میں مویشیوں اور بھیڑوں کی رکھوالی اور ان کی دیکھ بھال کا کام کرتے ہیں۔ دوسرے زیادہ تر اس بڑے شمالی علاقے میں رہتے ہیں جو اُن کے لیے مخصوص کر دیا گیا ہے۔ اب آسٹریلیا کی حکومت نے ان کی دیکھ بھال اور نگہبانی کے بہت سے قوانین بنائے ہیں۔

پچھلے چند برسوں میں آسٹریلیا کے اصلی باشندوں کے کچھ فنون کی طرف بھی

توجہ کی گئی ہے۔ بعض جگہ غاروں میں قدیم لوگوں کی بنائی ہوئی تصویریں ملی ہیں جن میں کنگارو، سانپ اور ایمو کی شکلیں بنائی گئی ہیں۔ بعض جگہ مردوں، عورتوں، مچھلیوں، انڈوں، بوم رینگ اور دوسرے ہتھیاروں کی بھدی سی تصویریں ملتی ہیں۔ شمالی حصے کے غاروں میں کچھ ایسی تصویریں بھی پائی گئی ہیں جن کے دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کو نقل کرنے کی تختی کے ذریعے سے بنایا گیا ہے لیکن یہ تصویریں بہت پرانی معلوم ہوتی ہیں اور دوسری تصویروں سے کم سے کم دو صدی پرانی ہیں۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ ان قدیم باشندوں کی موجودہ تصویریں جو ان کی ڈھالوں، بوم رینگ یا ان کے اپنے جسموں پر بنائی گئی ہیں، صرف خیالی ہیں۔ ان تصویروں میں پتے، دائرے، ٹیڑھی لکیریں اور زاویے بنائے گئے ہیں۔ جنوبی آسٹریلیا کے غاروں میں بہت بڑے بڑے مگرمچھوں کی تصویریں بھی ملتی ہیں، جن کے متعلق بعض تحقیق کرنے والوں کا خیال ہے کہ یہ اس زمانے میں بنائی گئیں جب یہ جانور اندرونی سمندر میں رہا کرتے تھے جو اَب غائب ہو چکا ہے۔

آسٹریلیا میں یہاں کے قدیم باشندوں کی بہت سی اور نشانیاں بھی موجود ہیں۔ آسٹریلیا کی ہزاروں ایسی جگہیں ہیں، جن کے نام انھی لوگوں کے رکھے ہوئے ہیں۔ عام طور پر یہ نام بڑے عجیب اور لمبے ہیں۔ جن میں سے وُولو مُولُو، بارا ماٹا، واگا واگا، کونڈا ٹُو، وَق ونڈا، نمونے کے طور پر پیش کیے جا سکتے ہیں۔

آٹھواں باب

تحقیق کے بحری سفر

اگرچہ کئی سال سے یہ خیال کیا جاتا تھا کہ جنوب میں خشکی کا کوئی بہت بڑا قطعہ موجود ہے، لیکن اوّلین سفید لوگ جنھوں نے آسٹریلیا کو دیکھا چند ولندیزی جہاز راں تھے۔ سپین کا ایک شخص کپتان لوئی دی، ٹوریز ۱۶۰۶ء میں فلپائن کو جاتے ہوئے نیوگنی اور راس یارک کی درمیانی آبنائے میں سے گزرا۔ ہم اس بات کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ اسے اس وقت یہ معلوم نہ ہو سکا ہوگا کہ اس کے چھوٹے سے جہاز کے جنوب میں ایک بہت بڑا برّاعظم واقع ہے۔

اس زمانے میں ولندیزی لوگ جزائر شرق الہند میں آباد ہونے کو آیا کرتے تھے، جنھیں اس وقت مسالے کے جزیرے کہا جاتا تھا۔ یہاں پہنچنے کے لیے وہ جنوبی افریقہ کے گرد چکر لگا کر بحرِ ہند میں شمال مشرق کے رُخ میں سفر کرتے ہوئے بیٹویا (جکارتا) پہنچتے تھے۔ اس سفر کے دوران میں طوفانوں کی وجہ سے ان کے اکثر جہاز اپنے راستے سے ہٹ جاتے اور اس طرح ان میں سے بعضوں نے آسٹریلیا کے شمال مغربی حصّے کو دیکھا ہوگا۔ اسی طرح ۱۶۰۶ء میں ایک چھوٹے سے جہاز ڈفکن کے مالک ولیم جانز نے خلیج کارپینٹریا کے مشرقی حصّے کو دیکھا۔ جانز نے اس سرزمین کو پسند نہ کیا۔ یہاں نہ تو سونا پایا جاتا تھا اور نہ تجارت سے کچھ فائدہ اٹھانے کی امید تھی اور اسے یہ تمام علاقہ بظاہر ایک ریگستان معلوم ہوتا تھا۔ اس کے دس سال بعد ایک اور ولندیزی کپتان ڈرک ہرٹاگ ایک اور راستے سے جزائر شرق الہند کو جاتے ہوئے آسٹریلیا کے شمال مغربی ساحل پر پہنچ گیا۔

وہ جہاز سے اتر کر خشکی پر آیا اور ایک جست کی پلیٹ پر اپنا اور اپنے جہاز کا نام اور تاریخ لکھ کر اسے کیلوں کے ساتھ ایک درخت سے باندھ دیا۔ آئندہ بیس سال میں پانچ چھ جہاز ڈرک ہرٹاگ لینڈ کے قریب سے گزرے اور انھوں نے اس سرزمین کو دیکھا۔ ایک جہاز جس کا نام پیلسارٹ تھا اس علاقے میں تباہ ہو گیا۔ اس کے کپتان نے ایک چپّو والی چھوٹی کشتی میں دور تک ساحل کے ساتھ ساتھ سفر کیا اور یہاں کا حال معلوم کیا۔

آخرکار ۱۶۴۲ء میں جزائر شرق الہند کے ولندیزی گورنر نے باقاعدہ ایک پارٹی کو آسٹریلیا کی دریافت کے لیے روانہ کیا۔ اس جہاز کا رہنما آبل جان تسمان تھا۔ اس کا چھوٹا جہاز زیادہ دور جنوب کی طرف نکل گیا جہاں اسے طوفانوں کا سامنا کرنا پڑا۔ وہاں سے وہ شمال مغرب کی طرف مڑا اور سفر کرتا ہوا آخرکار تسمانیا کے جزیرے میں پہنچ گیا۔ یہاں وہ لوگ خشکی پر اترے اور انھوں نے پانی بھی تلاش کر لیا، لیکن ان کی نظر میں یہ جزیرہ بالکل بے کار تھا۔ یہاں انھوں نے بہت بڑے بڑے گوند کے درخت دیکھے جن کے تنوں پر ایک ایک گز کے فاصلے پر گہرے شگاف تھے۔ یہ شگاف تسمانیا کے اصلی باشندوں نے کیے تھے جن کی مدد سے وہ شہد اور پوسم[1] کی تلاش میں ان درختوں پر چڑھتے تھے لیکن تسمان اور اس کی جماعت کے لوگوں نے یہ خیال کیا کہ ان کو جنوں نے بنایا ہے۔ تسمان نے بادبان کھول دیے اور مشرق کی طرف سفر کرنے لگا۔ اس طرح اس نے نیوزی لینڈ کو دریافت کیا۔ لیکن یہ جماعت برّاعظم آسٹریلیا کو دیکھے بغیر ہی واپس آ گئی۔ ولندیزوں نے اپنے نقشوں پر اس حصّے میں ایک مستطیل شکل بنا کر اس برّاعظم کو ظاہر کیا اور اس کا نام نیو ہالینڈ رکھا اور اس

---

[1] ایک اعلیٰ قسم کا تھیلی دار دودھ پلانے والا جانور جو پانی میں یا درختوں پر رہتا ہے۔

پر اپنے قبضے کا دعویٰ کیا، لیکن اس وقت تک انھیں جو کچھ اس ملک کے متعلق معلوم تھا اس کی وجہ سے وہ اسے زیادہ پسند نہ کرتے تھے۔

پہلا انگریز شخص جو آسٹریلیا پہنچا وہ ولیم ڈیمپیر تھا۔ یہ شخص ایک رہزن جہاز سگنٹ میں سفر کرتا ہوا، ۱۶۸۸ء میں یہاں پہنچا۔ اس کے ایک سال بعد وہ مشرقی ساحل کو دریافت کرنے کے لیے یہاں واپس آیا۔ لیکن طوفانوں کی وجہ سے وہ جنوب کے سرد بحری راستے سے آگے نکل گیا اور شمال مغربی ساحل پر پہنچ گیا جسے ولندیزی پہلے ہی دریافت کر چکے تھے۔ اس نے آسٹریلیا کے متعلق ایک کتاب لکھی جس میں اس ملک کی بہت زیادہ تعریف کی۔ اس کی وجہ سے یورپین لوگوں کو اس سے دلچسپی پیدا ہوئی۔

کچھ فرانسیسی جہاز رانوں نے بھی مشرقی ساحل کو دریافت کرنے کی کوشش کی، لیکن یہ برِاعظم پوری طرح، صرف اس وقت دریافت ہوا جب ۱۷۶۸ء میں برطانیہ کی بحری فوج کی طرف سے کپتان جیمز کُک کے ماتحت یہاں ایک دریافت کرنے والی مہم کو بھیجا گیا۔ کیپٹن کُک ایک چھوٹے جہاز میں جس کا نام اینڈیور تھا، طبیعیات کے ماہروں کی ایک جماعت کے ساتھ سیارۂ زہرہ کے مدار کا مشاہدہ کرنے کے لیے ٹہیٹی میں پہنچا۔ یہاں سے وہ جنوب کی طرف گیا اور نیوزی لینڈ کے ساحل کے گرد چکّر لگانے کے بعد مغرب کی طرف مڑا۔ اس طرح وہ آسٹریلیا کے مشرقی ساحل پر اس جگہ پہنچ گیا، جسے اب پوائنٹ ہکس کہتے ہیں۔ اس جگہ سے وہ ساحل کے ساتھ ساتھ شمال کی طرف روانہ ہوا۔ اور ساحل کی پیمائش کے ساتھ ہی ایسی جگہ کی تلاش میں مصروف رہا جہاں ان کا جہاز لنگر انداز ہو سکے۔ خشکی پر انھیں کچھ دُور پہاڑ دکھائی دیتے تھے، لیکن یہاں کوئی خلیج یا کسی دریا کا دہانہ موجود نہ تھا۔ انھوں نے ایک جگہ پست ساحل پر بھی اترنے کی کوشش کی، لیکن سمندر کی لہروں کی وجہ سے وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔ دو ہفتے تک اسی طرح سفر کرنے کے بعد وہ ایک کھلی خلیج

کے دہانے میں پہنچے اور اُس کے اندر داخل ہو کر جہاز کو لنگر انداز کیا۔ اِس جہاز میں علمِ طبیعیات کے ماہروں کی ایک جماعت بھی تھی جنھوں نے خشکی پر اتر کر وہاں کے عجیب پودوں اور درختوں کا مشاہدہ شروع کر دیا۔ یہاں آسٹریلیا کے کچھ اصلی باشندے بھی انھیں ملے جنھوں نے اُن پر نیزے پھینکے اور پھر غائب ہو گئے۔ علمِ طبیعیات کے ماہر یہاں کے پودے اور پھول اور عجیب و غریب پرندے اور جانور دیکھ کر بڑے حیران ہوئے۔ انھوں نے ان کے نمونے اکٹھے کیے اور اس جگہ کو خلیج باٹنی کا نام دیا۔

کُک تمام خلیجوں، جزیروں اور راسوں کو احتیاط سے نقشے پر درج کرتا ہُوا ساحل کے ساتھ ساتھ شمال کی طرف بڑھتا گیا۔ آخرکار وہ مونگے کی بڑی دیوار کے پاس پہنچ گئے۔ کُک اپنے جہاز کو لے کر دیوار اور ساحل کے درمیانی حصّے میں پہنچا، لیکن ایک دن ان کا جہاز ایک مونگے سے ٹکرایا اور اس کے پرانے تختوں میں ایک بہت بڑا سوراخ ہو گیا۔ اس حالت میں وہ جہاز کو لے کر بہت جلد ساحل کی طرف پہنچے۔ اسے کھینچ کر پست ساحل پر لے جایا گیا اور پہلو کے بل الٹا کر اس کی مرمت ہونے لگی۔ جب تک مرمت کا کام جاری تھا یہ لوگ اس علاقے کی دیکھ بھال میں مصروف رہے۔ یہ مہم آخرکار آسٹریلیا کے انتہائی شمالی کونے پر پہنچ گئی اور وہ آبنائے ٹورس میں سے گزر کر جزائر شرق الہند (انڈونیشیا) میں بٹیویا (جکارتا) میں پہنچ گئے۔ یہاں آدھے کے قریب جہازران بخار میں مبتلا ہو گئے اور بہت سے مر گئے۔ لیکن کُک بڑی بہادری کے ساتھ اسی جہاز کے ذریعے سے سفر کرتا ہوا واپس انگلستان پہنچ گیا۔ اس نے اس برّاعظم کے دو ہزار میل سے زیادہ مشرقی ساحل کا مکمل نقشہ تیار کر لیا۔

کُک کے سفر کے حالات اور علمِ طبیعیات کے ماہروں کی عجیب و غریب کہانیوں کی وجہ سے، جو انھوں نے اس برّاعظم کے متعلق بیان کیں، لندن میں آسٹریلیا کے

متعلق بڑی دلچسپی پیدا ہو گئی۔ تاہم سترہ سال اور گزر گئے۔ اس کے بعد برطانیہ نے یہاں ایک نوآبادی قائم کرنے کا فیصلہ کیا، لیکن یہ ایک آزاد نوآبادی نہ تھی بلکہ مجرموں اور قیدیوں کی ایک بستی بسانے کا فیصلہ کیا گیا۔ برطانیہ کے جیل قیدیوں سے بھر چکے تھے اور حکومت ان میں سے کچھ قیدیوں کو آسٹریلیا بھیجنا چاہتی تھی۔

چنانچہ ۱۷۸۶ء میں بحریہ سے ایک فارغ شدہ افسر کپتان آرتھر فلپ کو باٹنی بے جانے کے لیے ایک بحری بیڑا تیار کرنے کا حکم دیا گیا۔ یہ بیڑا آٹھ جہازوں پر مشتمل تھا جو بحر اوقیانوس میں جنوب کی طرف سفر کرتے ہوئے راس امید کے گرد چکر لگانے کے بعد جنوبی بحر اوقیانوس میں سے گزر کر پہلے تسمانیا پہنچا اور آخر کار یہ جنوری ۱۷۸۸ء میں باٹنی بے میں پہنچ گئے چونکہ باٹنی بے ایک نئی بستی کے لیے مناسب جگہ معلوم نہ ہوتی تھی، اس لیے وہ چند میل اور شمال کی طرف بڑھ کر ایک بڑی خلیج میں پہنچ گئے، جسے کک پہلے دیکھ چکا تھا۔

جو لوگ اس طرح یہاں پہنچے ان میں ۷۱۷ قیدی اور ۲۹۰ سپاہی، جہاز ران اور ان کے کنبوں کے لوگ شامل تھے۔ فلپ نے دیکھا کہ اس نئے ملک میں آباد ہونے کا کام اتنا آسان نہ تھا، جتنا وہ خیال کرتے تھے۔ یہاں کی زمین کو زیر کاشت لانے کے لیے سخت محنت کی ضرورت تھی۔ لیکن بہت سی مشکلوں اور ناکامیوں کے بعد یہ بستی بڑھنے لگی۔ اور جہاز بھی اور زیادہ قیدیوں کو لے کر پہنچ گئے۔ مکان بنائے گئے، فصلیں بوئی گئیں اور فارم قائم ہوئے۔ طرزِ حکومت فوجی قسم کا اور نہایت سخت تھا۔ فیصلے بہت مطلق العنان طریقے سے ہوتے تھے اور کوڑے لگانا اور دوسری خوفناک سزائیں عام تھیں لیکن اکثر قیدیوں کو ان کی قید کی میعاد ختم ہونے پر چھوڑ دیا جاتا تھا اور انھیں بستی میں چھوٹے چھوٹے فارم بنا کر آباد ہونے کی اجازت دے دی جاتی تھی۔ کچھ لوگ یہاں آباد ہونے کے لیے اپنی مرضی سے خود بخود پہنچ گئے۔ کچھ عرصے کے بعد یہ جگہ جس کا

نام سڈنی کوو ہو گیا کافی اہم ہو گئی اور جنوبی سمندروں میں سفر کرنے والے اکثر جہاز یہاں آکر ٹھہرنے لگے۔ وھیل مچھلی اور سیل کا شکار کرنے والے جہاز بھی یہاں آتے سوداگروں اور مختلف دکانداروں نے بھی اپنا کاروبار شروع کر دیا۔

یہ جگہ مہذب دنیا کے ایک دور دراز کنارے پر واقع تھی اور اس میں رہنے والوں کے اخلاق بھی اچھے نہ تھے۔ اسے صرف اس وقت کچھ اہمیت حاصل ہوئی جب یہ بات معلوم ہو گئی کہ یہاں کی گرم و خشک آب و ہوا بھیڑوں کی پرورش کے لیے سازگار ہے۔ جن سے بہت عمدہ اون حاصل ہو سکتی ہے۔ ایسی اچھی اون سپین کے سوا اور کسی ملک کی بھیڑوں کی نہیں ہوتی۔ چنانچہ بھیڑوں کا پالنا یہاں کا ایک اہم پیشہ بن گیا۔ فوج کے ایک افسر جون میکارتھر نے اپنی ملازمت سے استعفٰے دے کر اور یہاں پہنچ کر مرینو نسل کی بھیڑیں پالنا شروع کر دیں۔ اسے اس میں بڑی کامیابی حاصل ہوئی۔ اب بھیڑوں کے لیے اچھی چراگاہوں کی ضرورت بڑھ گئی۔

اگرچہ سڈنی کوو آسٹریلیا کی بہترین بندرگاہ تھی، لیکن اس کے قریب کی زمین اچھی نہ تھی اور نہ آبادکار ملک کے اندرونی حصے کی طرف بڑھ سکتے تھے۔ ساحلِ سمندر سے چالیس میل ہی کے فاصلے سے ایک سنگلاخ پہاڑی سلسلے کی چٹانیں شروع ہو جاتی تھیں۔ اس پہاڑ میں کوئی ایسی جگہ نہ تھی جہاں سے اسے آسانی سے عبور کیا جا سکتا۔ شمال اور جنوب میں بھی زمین ناہموار اور جنگلوں سے ڈھکی ہوئی تھی اور دریاؤں کی وجہ سے اس میں بہت سی گہری وادیاں بن گئی تھیں۔ ان وجوہ سے تیس سال تک نیو ساؤتھ ویلز کے علاقے کی آبادی سڈنی کوو کے ارد گرد صرف چند سو مربع میل تک محدود رہی۔

نواں باب

ساحل اور پہاڑ

کسی ملک کے جغرافیائی حالات کو معلوم کرنے کا سب سے عمدہ طریقہ یہ ہے کہ جن لوگوں نے اسے پہلے دریافت کیا، ان کے پیچھے قدم بہ قدم چل کر اسے دیکھا جائے۔ آئیے ہم آسٹریلیا میں اوّلین آنے والے لوگوں کے ساتھ ساتھ چلیں۔

کپتان فلپ کے سڈنی کوو میں آنے کے سات سال بعد آسٹریلیا میں کچھ ایسے نوجوان پہنچ گئے جن کے دل میں اس نامعلوم برّ اعظم کے اندرونی حصّوں کی دریافت کی زبردست خواہش تھی۔ انھی میں جارج باس ایک بتیس سالہ قد آور نوجوان جو ایک جہاز کا سرجن تھا اور میتھیو فلنڈرز اکیس سالہ نائب کپتان بھی تھے۔ فلنڈرز، روبن سن کروسو کی کہانی سے بڑا متاثر ہو چکا تھا، اور اسے پڑھنے کے بعد بحرِ جنوبی کا سفر بھی کر چکا تھا جس کے دوران میں اسے جہاز رانی اور نقشہ تیار کرنے کا بہت شوق پیدا ہو گیا تھا۔ ایک بڑے سفر میں فلنڈرز نے باس کو جہاز رانی کا کام بھی سکھا دیا۔ باس کے ساتھ منجملہ سامان ایک چھوٹی سی کشتی بھی تھی۔ یہ پورٹ جیکسن میں پہنچے تو اِن دونوں دوستوں نے اسے بندرگاہ میں اتار دیا، یہ کشتی نہایت چھوٹی تھی۔ اس کی لمبائی آٹھ فٹ اور چوڑائی پانچ فٹ تھی۔ وہ لوگ اسے "ٹوم تھم" کہتے تھے۔ نہایت جلد، وہ بندرگاہ سے نکل کر ناہموار ساحل کے ساتھ ساتھ جنوب کی طرف بڑھنے لگے۔ ان کے ساتھ ایک نوجوان لڑکا بھی تھا، جسے انھوں نے کشتی میں سے پانی نکالنے کے لیے اپنے ساتھ لے لیا تھا۔ کیونکہ بڑی بڑی لہروں کی وجہ سے اس چھوٹی کشتی میں پانی داخل ہو جاتا تھا۔ اس لڑکے نے بہت

محنت سے کام کیا۔ اس کا نام کسی کو معلوم نہیں، ورنہ وہ بھی شہرت کا حق دار تھا۔

انھوں نے باٹنی بے اور اس دریا کو جو اس میں گرتا ہے، بہت اچھی طرح دریافت کیا اور اس کا نقشہ تیار کر لیا۔ اس کے بعد وہ دوسری خلیجوں اور سمندری جھیلوں کو دریافت کرنے کے لیے روانہ ہو گئے۔ یہاں ان کی کشتی طوفان میں گھر گئی اور لہروں نے انھیں اٹھا کر ساحل پر پھینک دیا۔ جب وہ ریتلے ساحل پر اپنے کپڑے خشک کر رہے تھے تو آسٹریلیا کے کچھ اصلی باشندوں نے پیچھے سے آ کر انھیں گھیر لیا اور نیزوں اور بُوم رینگ سے ان پر حملہ آور ہوئے، لیکن فلنڈرز کود کر کھڑا ہو گیا اور انھیں ایک بہت بڑی قینچی دکھائی۔ ان لوگوں نے اس سے بڑی دلچسپی کا اظہار کیا اور فلنڈرز نے ایک ایک کرکے ان لوگوں کی لمبی ڈاڑھیوں کو اس سے کاٹا، جس سے وہ بڑے خوش ہوئے۔

دوسری بار باس چھ قیدیوں کے ساتھ ایک وھیل پکڑنے والی کشتی میں روانہ ہوا۔ اس دفعہ فلنڈرز اس کے ساتھ نہ تھا، کیونکہ اسے بحریہ کی خدمات کے سلسلے میں پورٹ جیکسن میں ٹھہرنا پڑا۔ باس جنوب کی طرف روانہ ہوا اور اس نے تقریباً آٹھ سو میل لمبے ساحل کو دریافت کرکے اس کا نقشہ بنایا۔ وہ اس طرح برّاعظم کے آخری جنوب مشرقی کونے میں ویسٹرن پورٹ کی خلیج میں پہنچ گیا۔ باس کے اس بحری سفر سے پہلی بار یہ بات دریافت ہوئی کہ تسمانیا اور برّاعظم کے درمیان سمندر واقع ہے۔

چند سال بعد ایک اور "دریافت کنندہ" نوجوان لیفٹیننٹ جیمز گرانٹ پہلی بار پورٹ جیکسن سے آبنائے باس کے راستے انگلستان پہنچا۔ باس کی وہ چھوٹی کشتی، جس میں اس نے یہ سفر کیا لوگوں کی نظر میں بڑی قدر و منزلت رکھتی تھی اور سڈنی کود میں اسے سمندر سے نکال کر خشکی پر لایا گیا، جہاں بہت سے لوگ اسے دیکھنے کے لیے آتے رہے۔ بعد میں اسے توڑ کر اس کی لکڑی سے چھوٹے چھوٹے نسوار کے ڈبے بنائے گئے جو تحفے کے طور پر دیے جاتے تھے۔

باس اور فلنڈرز کو ان کے اگلے سفر کے لیے ایک بڑی کشتی دی گئی، جس میں ان دونوں نے تسمانیا کے گرد چکر لگا کر اس کے طبعی حالات کو دریافت کیا اور یہ بھی معلوم کیا کہ یہاں کس کس جگہ بستیاں قائم ہو سکتی ہیں۔ اس کارنامے کے بعد یہ دونوں نوجوان انگلستان پہنچے، جہاں باس نے ایک چھوٹے تجارتی جہاز میں کچھ حصے خرید لیے۔ چند سال بعد وہ پھر سڈنی واپس آ گیا اور یہاں سے بحرالکاہل کے راستے پیرو کی طرف روانہ ہوا۔ یہ سفر اس نے وہاں سے ایک خاص قسم کے اون پیدا کرنے والے جانور "لاماکولانے" کے لیے کیا۔ اس کا خیال تھا کہ نیو ساؤتھ ویلز کے علاقے میں اسے پال کر اس سے اون حاصل کی جا سکتی ہے۔ باس کے متعلق، اس کے بعد کوئی خبر معلوم نہ ہو سکی۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اسے سپین والوں نے گرفتار کر لیا اور قیدی بنا کر چاندی کی کانوں میں کام کرنے کے لیے بھیج دیا، اور وہ وہیں مر گیا۔

فلنڈرز اس وقت تک کافی شہرت حاصل کر چکا تھا۔ اب اسے دریافت کرنے کے لیے ایک جہاز دیا گیا، جس کا نام اس نے "انویسٹی گیٹر" (تحقیق کنندہ) رکھا اور ۱۸۰۳ء میں آسٹریلیا کے گرد چکر لگانے کے لیے روانہ ہوا۔ اس کا یہ مصمم ارادہ تھا کہ وہ برِ اعظم آسٹریلیا کو اس طرح مکمل طور پر دریافت کر لے کہ کوئی کوتاہی نہ رہ جائے۔ اس سفر میں اسے دس ہزار میل کے قریب فاصلہ طے کرنا تھا۔ وہ اس تمام عرصے میں ناہموار اور ویران ساحل کے ساتھ ساتھ سفر کرتا رہا۔ یہاں کسی قسم کی آبادی نہ تھی، صرف کہیں کہیں آسٹریلیا کے کچھ ڈرپوک اصلی باشندے دیکھے گئے، لیکن ان کے سوا اُسے سارے سفر میں اور کوئی شخص نہ مل سکا۔ اس نے نہایت صحت کے ساتھ ہزاروں جزیروں، مونگے کی دیواروں، خلیجوں، راسوں، آبناؤں اور تنگ کھاڑیوں کا نقشہ تیار کیا۔ اس نے اُن میں سے ہر ایک کے لیے جو جو نام رکھے وہ کسی نہ کسی واقعے کی یاد میں تھے۔ مثلاً جنوبی آسٹریلیا میں کیپ کیٹس ٹرافی یا "تباہی کی راس" کا یہ نام اس لیے رکھا گیا کیونکہ

یہاں ایک کشتی کے اُلٹ جانے سے اس کے چھ آدمی مر گئے تھے۔ فلنڈرز نے اس سفر سے یہ بات ثابت کر دی کہ آسٹریلیا ایک بہت بڑا جزیرہ ہے، جس کے ساحل میں بہت کم خلیجیں اور کھاڑیاں ہیں۔

جب فلنڈرز آسٹریلیا کے گرد چکر لگانے کے سفر میں مصروف تھا تو اسے "اینکونٹربے" کے مقام پر ایک فرانسیسی جہاز "لاجیاگرفی" ملا جس کا کپتان نیکوس باڈن تھا' اور وہ بھی ساحل کا نقشہ تیار کرنے میں مصروف تھا۔ اگرچہ اس وقت برطانیہ اور فرانس کے تعلقات اچھے نہ تھے' لیکن یہ دونوں دریافت کرنے والے بہت دوستانہ طریقے سے ایک دوسرے سے ملے۔ باڈن کو دیکھنے کے بعد فلنڈرز نے چاہا کہ وہ اس سے پہلے اپنی دریافت کی خبر لے کر انگلستان پہنچ جائے، چنانچہ وہ بہت تیزی کے ساتھ روانہ ہوا' لیکن اس کا جہاز راستے میں تباہ ہو گیا اور اسے سڈنی واپس آنا پڑا جہاں اسے صرف ایک بہت چھوٹا سا جہاز سفر کے لیے مل سکا، لیکن اسے اپنی جہاز رانی پر اس قدر اعتماد تھا کہ وہ اسی میں روانہ ہو گیا۔ شمالی آسٹریلیا کے گردِ چکر لگانے کے بعد وہ بحرِ ہند میں داخل ہوا۔ یہاں اس کے اس چھوٹے جہاز میں شگاف ہو گیا اور اسے مجبوراً ماریشش میں فرانسیسیوں کے قبضے میں چھوڑنا پڑا۔ اسے ابھی تک یہ معلوم نہ ہو سکا تھا کہ برطانیہ اور فرانس کے درمیان جنگ چھڑ چکی ہے۔ ایک تند مزاج فرانسیسی گورنر نے اس کے پاسپورٹ کو نہ مانا' اور اسے قید کر دیا جہاں وہ ساڑھے چھ برس تک قید میں رہا۔

آخرکار جب فلنڈرز انگلستان پہنچا تو وہ بیمار اور بہت کمزور ہو چکا تھا، لیکن پھر بھی اس نے اپنے سفر کے متعلق ایک کتاب لکھی۔ اتفاق کی بات ہے کہ جس دن یہ کتاب چھپی اسی روز فلنڈرز کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت اس کی عمر چالیس سال تھی۔ وہ بہت غربت کی حالت میں مرا لیکن اس کے مرنے کے بعد، ایک صدی تک جہاز ران اس کے تیار کیے ہوئے نقشے استعمال کرتے رہے۔

دسواں باب

پہاڑ اور میدان

جن دنوں بحری سیاح برِاعظم کے ساحلوں کے نقشے تیار کر رہے تھے، سڈنی کے آباد کار اور آزاد شدہ قیدی پہاڑوں اور جنگلوں کی رکاوٹوں کو عبور کر کے ملک کے اندرونی حصے میں داخل ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ جارج باس اور بہت سے دوسرے لوگوں نے بلیو مونٹینز میں ایسے درّوں کی بہت تلاش کی جن کے راستے سے وہ اسے عبور کر سکیں، لیکن ہر جگہ وادیوں کے ختم ہونے پر بلند اور سیدھے کھڑے پہاڑ ملتے تھے جن پر یوکلپٹس اور دوسرے درختوں کے گھنے جنگل تھے۔ آخر کار جب اس بستی کو یہاں آباد ہوئے پچیس سال گزر گئے تو ایک کسان گرگری بلاکس لینڈ نے متواتر قحط سالی کی وجہ سے نئی چراگاہیں تلاش کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔

بلاکس لینڈ اس ارادے سے ۱۸۱۳ء میں لفٹیننٹ ولیم لاسن اور ایک اور نوجوان ولیم چارلز وینٹ ورتھ اور چار قیدیوں کے ساتھ روانہ ہوا۔ ولیم لاسن آسٹریلیا ہی میں پیدا ہوا تھا اور بعد میں یہاں کا بڑا مشہور سیاستدان بنا تھا۔ درّے کی تلاش کرنے کے بجائے وہ پہاڑ کی ایک قریب ترین چوٹی پر چڑھ گئے۔ اتفاق سے اس جگہ پہاڑ کا سلسلہ شرقاً غرباً واقع تھا۔ بلاکس لینڈ کی جماعت کمپاس کی مدد سے آگے بڑھ رہی تھی اور ہر دو ہزار قدم کے بعد وہ ایک میل شمار کر لیتے تھے۔ وہ گہری وادیوں اور گھنے جنگلوں میں سے چھ میل روزانہ کے حساب سے آگے بڑھتے رہے۔ آخر کار وہ ایک بلند جگہ پر پہنچے جسے انھوں نے مونٹ یارک کا نام دیا۔ یہاں مغرب میں دُور تک ان کے سامنے ایک بلند سطح مرتفع چلی گئی تھی، جس کی زمین کافی زرخیز تھی۔ چھ مہینے بعد پہاڑ کی اس گھاٹی کے اوپر

سے ایک سڑک بنا دی گئی اور آباد کار اس نئی زمین پر پہنچنے لگے۔ اس طرح ایک نئی بستی قائم ہو گئی جس کا نام باتھرسٹ رکھا گیا۔ اس کے بعد دریافت کرنے والے شمال اور جنوب کی طرف بڑھتے رہے۔

دریافت کرنے والوں میں سب سے بڑا کارکن جون آکسلے تھا جو پہلے بحریہ افسر رہ چکا تھا اور اب نیو ساؤتھ ویلز کی ریاست کا سرویئر جنرل بن گیا تھا۔ باتھرسٹ سے آگے بڑھ کر آکسلے نے بہت سے دریاؤں کو دریافت کیا جن کو اس نے میکاری، لیچلان اور مرم بڈگی کے نام دیے۔ یہ تمام دریا پہاڑوں میں سے نکل کر مغرب کی طرف بہت بڑی بڑی دلدلوں اور جھیلوں میں گرتے تھے۔ آکسلے لکھتا ہے کہ اس ملک میں جابجا دریا موجود تھے۔ ہر پہاڑ میں کوئی نہ کوئی چشمہ تھا اور ہر وادی میں کوئی نہ کوئی دریا بہتا تھا۔

آکسلے نے سڈنی کے شمال میں ایک اور سفر بھی کیا۔ وہ شمالی پہاڑ کے کنارے کو عبور کرنے کے بعد ایک کھلے زرخیز میدان میں پہنچ گیا جس کا نام اس نے لیور پول کا میدان رکھا۔ یہاں سے وہ پھر ایک لمبا چکر لگا کر جنوب کی طرف مڑ گیا اور شمال مغرب کی طرف سے باتھرسٹ میں پہنچ گیا۔ اس مہم میں اس نے بارہ دریاؤں کو عبور کیا جو سب کے سب مغرب کی طرف بہتے تھے۔

آکسلے کے ایک ساتھی، علم طبعیات کے ماہر، ایلن کننگھم نے میدان میں داخل ہونے کے لیے کوئی آسان راستہ معلوم کرنے کی کوشش میں ایک شمالی درّہ دریافت کر لیا اور بہت جلد باتھرسٹ اور اس عجیب و غریب شمالی علاقے کے درمیان یہ ایک بڑا راستہ بن گیا۔ اس کا نام پنڈ درا کا درہ رکھا گیا۔ کننگھم نے تین بڑے دریا دریافت کیے جن کے نام گواڈیر، ڈوماریسک اور گونڈا مائن تھے۔ اور یہ سب مغرب کی طرف بہتے تھے۔

سمندر کے راستے اس نئے شمالی علاقے میں پہنچنے کے لیے آکسلے نے ایک جہاز میں اس ساحل کے ساتھ ساتھ جس کا کُک اور فلنڈرز نقشہ تیار کر چکے تھے، شمال کی طرف

سفر کیا۔ سڈنی کو وہ سے آٹھ سو میل شمال میں اُس جگہ جس کو کُگ نے مورٹن بے کا نام دیا تھا اس نے آسٹریلیا کے چند اصل باشندے دیکھے جو ایک جزیرے پر کھڑے اسے اشارہ کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک جو دوسروں سے زیادہ جوشیلا معلوم ہوتا تھا اور جس کا رنگ قدرے سفید تھا ایک سفید نسل کا آدمی نکلا جو کسی تباہ ہونے والے جہاز میں سے بچ کر یہاں پہنچ گیا تھا۔ اس شخص نے آکسلے کو ایک نیا دریا دکھایا جو مورٹن بے میں گرتا تھا۔ آکسلے نے اس کا نام دریائے برسبین رکھا اور آج برسبین کا شہر اسی جگہ آباد ہے۔ کننگم نے نئے جنوبی علاقے سے مورٹن بے کا راستہ بھی دریافت کیا اور ایک دوسرے "دریافت کرنے والے" میجر ایڈمنڈ لوکیر نے دریائے برسبین کو دریافت کرتے ہوئے لکھا۔ "جس ملک میں سے اب ہم گزر رہے ہیں، اس سے عمدہ کوئی اور سرزمین نہیں ہو سکتی"۔

اس عرصے میں دو اور آباد کار ہملٹن ہیوم جو سڈنی ہی میں پیدا ہوا تھا اور ولیم ہلٹن ہوویل جو پہلے ایک بحری کپتان رہ چکا تھا، لیک جارج سے جنوب کی طرف بڑھے اور ایک برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑی سلسلے کے ساتھ ساتھ جاتے ہوئے پانچ چھ دریاؤں کو عبور کرنے کے بعد سمندر تک پہنچ گئے۔ انھوں نے اس پہاڑی سلسلے کا نام آسٹریلوی الپس رکھا۔ اس جگہ ایک نہایت خوبصورت خلیج تھی، جسے انھوں نے باس ویسٹرن پورٹ سمجھا، لیکن درحقیقت انھوں نے حساب میں غلطی کی تھی، اور وہ اس سے ایک ڈگری آگے نکل چکے تھے اور یہ جگہ لفٹیننٹ مرے پورٹ فلپ تھی۔ اس کے بعد ۱۸۳۵ء میں تسمانیا کا ایک کسان جس کا نام جان بیٹ مین تھا ایک چھوٹے جہاز میں پورٹ فلپ سے روانہ ہوا اور ایک ایسی جگہ پہنچا جو ایک بستی کے لیے بڑی موزوں تھی۔ اس نے وہاں کے مقامی قبیلے کے باشندوں کے ساتھ سودا کر کے چھ لاکھ ایکڑ زمین حاصل کر لی۔ اس کے عوض میں اس نے ان کو کچھ کلہاڑے اور کمبل زمین کی قیمت کے طور پر ادا کیے۔ یہ زمین جو بیٹ مین نے خرید کی دریائے یارا یارا پر واقع تھی۔ بعد میں آسٹریلیا کی حکومت نے اس سودے کو منسوخ کر دیا۔ اس جگہ آج میلبورن کا شہر واقع ہے۔

نیو ساؤتھ ویلز کے علاقے میں بہت سے دریا مغرب کی طرف بہتے تھے۔ سب اس بات سے حیران تھے کہ یہ اس رُخ پر بہتے ہوئے کہاں پہنچتے ہیں۔ بعض کا خیال تھا کہ شاید یہاں کوئی بہت بڑا اندرونی سمندر ہے یا بہت سی جھیلیں ہیں۔ ایک انگریز فوجی افسر کیپٹن چارلز سٹرٹ نے جس کی رجمنٹ اس وقت سڈنی میں مقیم تھی اس بات کے دریافت کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ دریائے میکاری کے ساتھ ساتھ روانہ ہوا، یہاں تک کہ یہ ایک اور بڑے دریا میں مل گیا۔ یہ بڑا دریا اونچے اونچے کناروں کے درمیان آگے کی طرف بہہ رہا تھا۔ جب دریافت کرنے والوں نے جھک کر اس دریا کا پانی پیا تو اسے نمکین پایا۔ پہلے تو وہ بڑے حیران ہوئے اور یہ خیال کیا کہ شاید وہ سمندر کے بہت قریب پہنچ چکے ہیں، لیکن بعد میں یہ ثابت ہوا کہ یہ نمک دریا کے پانی میں اس زمین سے حل ہوتا تھا جو قدیم زمانے کے اندرونی سمندر کے خشک ہو جانے سے بن گئی تھی۔ سٹرٹ نے اس نوآبادی کے گورنر کے نام پر اس دریا کو "ڈارلنگ" کا نام دیا اور چند مہینے بعد اس کی دریافت کے لیے ایک اور مہم روانہ کی گئی۔

اس دفعہ وہ دریائے مروم بڈگی کے ساتھ ساتھ، برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑوں میں سے جو اس کا منبع ہیں اس جگہ تک چلے گئے جہاں اس میں جہاز رانی ہو سکتی تھی۔ یہاں سے آگے انھوں نے اس دریا میں ایک وھیل گیر کشتی میں سفر کیا جو اپنے ساتھ لائے تھے۔ اگلے روز ان کی کشتی ایک زیرِ آب چٹان سے ٹکرا کر الٹ گئی اور ان کا بہت سا سامان ضائع ہو گیا۔ ایک ہفتے تک سفر جاری رکھنے کے بعد وہ ایک اور بڑے دریا میں پہنچ گئے۔ یہ نیا دریا جو انھوں نے دریافت کیا بہت فراخ تھا۔ سٹرٹ نے اس دریا کو برطانوی نوآبادیوں کے سیکرٹری کے نام پر "مرے" کا نام دیا۔ نو دن بعد سٹرٹ کی جماعت نے ایک اور دریا دیکھا جو شمال کی طرف سے دریائے "مرے" میں گرتا تھا۔ وہ اسے "دریائے ڈارلنگ" سمجھے۔ یہ بڑا دریا تیزی سے بہتا ہوا آگے جا کر بلند کناروں کے درمیان ایک تنگ جگہ سے گزرتا تھا۔ جب یہ لوگ اپنی وھیل کشتی میں ایک چکر میں

سے گزر رہے تھے تو انھوں نے آسٹریلیا کے بہت سے اصلی باشندوں کو دیکھا جو اپنے ہاتھوں میں نیزے لیے ہوئے، ان پر حملہ کرنے کے لیے تیار تھے۔ سٹرٹ پہلے تو ان کے رہنما پر گولی چلانے کے لیے تیار ہو گیا لیکن جوں ہی اس نے بندوق کے ساتھ ہی منکوں کا ایک ہار بھی نکالا تو چار آسٹریلوی باشندے دریا کے دوسرے کنارے پر نمودار ہوئے اور اسے عبور کرنے کے بعد خشکی پر پہنچ گئے۔ انھوں نے ان کے رہنما کو پکار کر کچھ کہا، جسے سن کر انھوں نے نیزوں کو نیچے کر لیا اور خاموش ہو گئے۔ اس کے بعد وہ "دریافت کرنے والوں" کے پاس پہنچ گئے اور ان سے تحفے وصول کرنے لگے۔

سٹرٹ اس بڑے دریا کے ساتھ ساتھ آگے چلتا گیا، یہاں تک کہ ایک بہت بڑی جھیل میں پہنچ گیا جسے اس نے اس شہزادی کے نام پر جو بعد میں ملکہ وکٹوریہ بننے والی تھی، اسے جھیل الیگزنڈریا کا نام دیا۔ یہ جھیل آگے جا کر بحرِ جنوبی سے مل جاتی تھی۔ لیکن سٹرٹ اس جھیل کے دہانے سے آگے نہ بڑھا۔ اس کی جماعت اب بہت تھک چکی تھی اور ان کے پاس خوراک بھی بہت کم ہو گئی تھی۔ اس لیے وہ اب یہاں سے واپسی کے لیے روانہ ہو گئے۔ یہاں سے انھیں دریا کے پانی کے خلاف ایک ہزار میل لمبا سفر کرنا تھا۔ چھ ہفتے تک سفر کرنے کے بعد بھی وہ دریائے مرم بدگی پر اپنے پہلے کیمپ سے ابھی نوّے میل دُور تھے۔ اب وہ بالکل تھک کر دریا کے کنارے پر ٹھہر گئے۔ سٹرٹ نے دو مضبوط آدمیوں کو اس سے آگے دریا کے کنارے کنارے خشکی کے راستے بھیجا۔ وہ چھ دن کے بعد کچھ خوراک لے کر ان کے پاس پہنچے۔ اس وقت ان کی خوراک بالکل ختم ہو چکی تھی اور اگر وہ کچھ اور دیر کرتے تو ان کے لیے سخت مشکل کا سامنا ہوتا۔

سٹرٹ کے کام کو سکاٹ لینڈ کے ایک باشندے میجر تھامس مچل نے جاری رکھا۔ اس نے شمال اور شمال مغرب کے بہت سے دریاؤں کی گزرگاہوں کو معلوم کر کے یہ ثابت کیا کہ وہ سب دریائے "مرے" میں گرتے ہیں۔ اس کے بعد وہ جنوب کی طرف چلا گیا اور یہاں

بھی اس نے بہت احتیاط سے اُن تمام دریاؤں کی گزرگاہوں کو دریافت کیا، جنھیں ہیوم اور ہوویل نے عبور کیا تھا۔ یہ سب دریا "دریائے مرے" کے معاون تھے۔ اس طرح سے برّاعظم آسٹریلیا کے جنوب مشرقی دریاؤں کا بڑا نظام دریافت ہو گیا۔ یہ دریائی نظام شمالی امریکا کے دریائے مسوری کے دریائی نظام سے بہت ملتا جلتا ہے لیکن اس میں پانی کی مقدار نسبتہً کم ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ مشرقی سلسلۂ کوہ کا سارا پانی ان دریاؤں میں نہیں پہنچتا اور جس علاقے میں سے یہ دریا بہتے ہیں وہاں زمین بہت نرم ہے اور ان کے پانی کا بہت سا حصّہ زمین میں جذب ہو کر قریب کی دلدلوں میں پہنچ جاتا ہے۔

سٹرٹ اور مچل کی دریافتوں سے جو معلومات حاصل ہوئے اُن سے دریائے مرے کے دہانے کے قریب ایک نئی آبادی کے قائم کیے جانے کا امکان بڑھ گیا۔ ۱۸۳۱ء میں کپتان کولٹ بارکر کو بھیجا گیا تاکہ وہ یہ معلوم کر سکے کہ آیا سٹرٹ کی دریافت کردہ "جھیل الیگزنڈریا" اور فلنڈرز کی دریافت کردہ خلیج سینٹ وِن سینٹس کا آپس میں کوئی تعلق ہے۔ اس نے اس خلیج کے کنارے وہ خوبصورت میدان دریافت کیا جو ہر طرف سے پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے اور جس جگہ آج ایڈی لیڈ کا شہر آباد ہے۔ اس کے بعد جب وہ دریائے مرے کو تیر کر عبور کر رہا تھا تو آسٹریلیا کے ایک باشندے نے جس نے اس سے پہلے کبھی سفید انسان کو نہ دیکھا تھا، بھوت سمجھ کر نیزے سے مار ڈالا۔

اس عرصے میں میجر لوکیر چوالیس سپاہیوں اور کچھ قیدیوں کے ساتھ برّاعظم کے جنوب مغربی کونے میں کنگ جارج ساؤنڈ میں پہنچ گیا، جہاں شہر البینی واقع ہے۔ اس طرح مغربی آسٹریلیا بھی نیو ساؤتھ ویلز کا ایک حصّہ بن گیا اور سارے کا سارا ملک انگریزوں کے قبضے میں آگیا۔ اس کے ڈھائی سال بعد کپتان جیمز سٹرلنگ، کنگ جارج ساؤنڈ کے مغربی اور شمالی ساحل کے ساتھ ساتھ سفر کرتا ہوا دریائے سوان تک پہنچا اور یہاں شہر پرتھ اور فری مینٹل کی بندرگاہ کی بنیاد رکھی گئی۔ ۱۸۲۹ء میں مغربی آسٹریلیا کو ایک جداگانہ نوآبادی بنا دیا گیا۔

گیارھواں باب

بھیڑیں اور مویشی چرانے والے

اس نئے ملک کے متعلق جو تحقیق کرنے والوں کی کوشش سے اب بخوبی دریافت ہو چکا تھا، سب سے زیادہ عجیب بات یہ تھی کہ یہ بالکل خالی تھا۔ یہاں نہ تو ایسے لوگ رہتے تھے جو آنے والوں کا مقابلہ کرتے اور نہ کسی جگہ کوئی جھونپڑا، مکان یا گاؤں دکھائی دیتا تھا۔ وحشی درندے، بلند پہاڑ یا ناقابلِ عبور جنگل بھی موجود نہ تھے۔ اس لیے یہاں آنے والوں کے لیے راستہ بالکل صاف تھا اور لاکھوں انسانوں کے لیے یہاں آباد ہونے کی گنجائش تھی۔

ہزاروں لوگ بھیڑوں اور مویشیوں کے ساتھ پہاڑوں کے دروں میں سے گزر کر اُن سے آگے زرخیز میدانوں میں داخل ہو رہے تھے۔ یہ لوگ گوشت اور تھوڑے سے آٹے پر گزارا کرتے ہوئے آگے نئی زمین میں پہنچ رہے تھے۔ وہ جہاں بھی اچھی چراگاہیں دیکھتے، وہاں ٹھہر کر بھیڑوں اور مویشیوں کے مرکز قائم کر لیتے اور پھر یہاں سے آگے بڑھتے چلے جاتے۔ ان میدانوں میں ان کے جانور بڑی آزادی سے دوڑتے پھرتے۔ اور اس وجہ سے وہ جس جگہ ٹھہرتے، وہ عام طور پر بھیڑوں کے دوڑنے کے میدان کہلاتی۔ یہاں آباد ہونے والوں میں آزاد آبادکاروں کے علاوہ بہت سے ایسے قیدی بھی شامل تھے جو اپنی قید کی میعاد ختم کر چکے تھے۔ بہت سے ایسے نوجوان تھے جو آسٹریلیا ہی میں پیدا ہوئے تھے اور اپنی قسمت آزمائی کرنا چاہتے تھے۔ بھیڑوں کو پالنے والے، اکثر حکومت سے، اُن کی نیک چلنی کے ضامن بن کر قیدیوں کو چرواہوں کے طور پر رکھ لیتے اور جو جگہ پسند کرتے وہاں بیٹھ جاتے۔ اسی وجہ سے ان لوگوں کو بعد میں سکویٹر یا "بیٹھنے والے" کہا جانے لگا۔ اب یہ سوال پیدا ہوا کہ آیا ان لوگوں کو ایسا

کرنے کا حق بھی حاصل ہے۔ اصول کے مطابق ساری زمین حکومت برطانیہ کی ملکیت تھی۔ لیکن ان مویشی پالنے والوں کو یہاں سے نکالنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ اکثر وہ نوآبادی کی حکومت کے صدر مقام سے سیکڑوں میل دُور ہوتے تھے اور حکومت کے پاس کافی پولیس یا سپاہی نہ تھے کہ ان کو یہاں سے ہٹا سکیں۔ انگلستان کی پارلیمنٹ میں اس موضوع پر بہت سی بحثیں ہوئیں۔ لیکن آخرکار حکومت کو ماننا پڑا اور مویشی پالنے والوں کو اپنی زمینوں پر قبضہ رکھنے کی اجازت دے دی گئی۔ چونکہ وہ یہاں سب سے پہلے پہنچے تھے، اس لیے یہ مان لیا گیا کہ انھیں دوسروں سے پہلے اس زمین کے خریدنے کا حق حاصل ہے۔ اس غرض کے لیے انھیں صرف تھوڑی سی رقم ادا کرنی ضروری تھی۔ چند سال بعد سکویٹرز کے حقوق کا ایک مستقل قانون بن گیا۔

اس طرح سے آسٹریلیا کی اُون کی صنعت کا آغاز ہوا۔ مویشی پالنے والوں کو جلد ہی معلوم ہو گیا کہ یہاں کے میدان بھیڑوں کے چرنے کے لیے نہایت موزوں ہیں۔ ان کے ریوڑ جلد جلد بڑھنے لگے۔ ہر سال بہت سی اون اتاری جاتی، اسے دبا کر گانٹھیں تیار کی جاتیں جو بیل گاڑیوں کے ذریعے سے سڈنی یا میلبورن کی بندرگاہوں میں پہنچا دی جاتیں۔ اس جگہ بڑے بڑے گوداموں کے قریب اسے لندن لے جانے کے لیے تیز رفتار جہاز موجود ہوتے۔ ایسی حالت میں جب یورپ اور امریکا کے کارخانوں کے لیے ضرورت کے مطابق اون میسر نہ آتی تھی، انگلستان کی گرم کپڑے کی صنعت بہت ترقی کرنے لگی۔ آسٹریلیا کے سکویٹر چند ہی سال میں بڑے دولتمند ہو گئے۔

اس وقت آسٹریلیا میں بارہ کروڑ بھیڑیں ہیں۔ پوری ایک صدی تک بڑی احتیاط سے بھیڑوں کی اچھی نسل حاصل کرنے کے بعد اب یہاں نہایت اعلیٰ نسل کی بھیڑیں پالی جاتی ہیں۔ ان کو آسٹریلین میرینو کہتے ہیں۔ اس نسل کی بھیڑیں نہایت عمدہ اور لمبی اون پیدا کرتی ہیں اور یہاں کے گرم اور خشک موسم میں خوب نشوونما پاتی ہیں۔ عمدہ قسم کی

اُون چُننا اور اُسے مختلف درجوں میں تقسیم کرنا اب ایک بڑا فن سمجھا جاتا ہے اور یارک شائر اور میسا چوسٹس اور دنیا کے دوسرے حصّوں کے اونی صنعت کے مالک جب اپنے کارخانوں کے لیے آسٹریلیا سے اُون منگواتے ہیں تو انھیں ٹھیک طور پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس قسم کی اون حاصل کریں گے۔ وہ اسی کے مطابق اپنی مشینوں کو تیار رکھتے ہیں۔ پچھلی جنگ کے دوران میں آسٹریلیا کی اُون کی بڑی مانگ تھی اور سارے برّاعظم کی تمام اون ایک مقررہ قیمت ساڑھے تیرہ پنس فی پونڈ کے حساب سے خرید لی گئی تھی۔ ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۵ء تک آسٹریلیا کو اس تمام اون سے دس کھرب ڈالر کی رقم حاصل ہوئی۔

بھیڑیں پالنے والوں کے مراکز اب نہایت آرام دہ ہیں اور بعض میں آسائش کے سب سامان موجود ہوتے ہیں۔ لیکن ان میں سے بعض اوّلین آباد کاروں کی روایت کے مطابق بہت سادہ ہیں۔ گھوڑے گاڑیوں اور بیل گاڑیوں کی جگہ اب موٹریں اور ٹرک استعمال ہوتے ہیں اور ریل گاڑی کی وجہ سے دُور دراز کے فاصلے بھی کم ہو گئے ہیں۔ کچھ سکوئٹرز اپنے ذاتی ہوائی جہازوں میں سفر کرتے ہیں۔ بھیڑوں کے کسی بڑے مرکز پر کام کرنے والوں کے گھر ایک چھوٹے شہر سے کم نہیں ہوتے۔ وہاں ان کے اپنے سٹور، ڈاک خانے، لوہار کی دکان، گیس سٹیشن وغیرہ تمام چیزیں موجود ہوتی ہیں۔ یہاں کام کرنے والوں کے بہت سے کنبے رہتے ہیں۔ ہر سال بھیڑوں کی اُون اُتارنے کے لیے سیکڑوں لوگ باہر سے بھی آتے ہیں۔ بھیڑوں کے مالک اور اس کے کُنبے کے علاوہ یہاں ایک نگران، باڑے کی نگہبانی کرنے والے سوار اور کاروبار سیکھنے والے متعدد نوجوان موجود ہوتے ہیں۔ اکثر باڑوں میں بھیڑوں کی بہت زیادہ تعداد ہے۔ اور ان کی دیکھ بھال کے لیے لگاتار توجہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ چراگاہوں پر نظر رکھی جاتی ہے اور جب ایک جگہ گھاس ختم ہو جائے تو بھیڑوں کو دوسرے میدانوں میں لے جایا جاتا ہے تاکہ پہلی چراگاہ میں دوبارہ گھاس پیدا ہو سکے۔ ان کے پینے کا پانی ہر وقت موجود ہونا چاہیے۔ اس بات کا بھی بڑا خیال رکھا جاتا ہے کہ یہ پانی ہر قسم کی

آلودگی سے پاک ہو۔ جب بھیڑیں بچے دیتی ہیں تو مادہ بھیڑوں اور اُن کے چھوٹے بچوں کا خاص خیال رکھنا پڑتا ہے۔ اُن کے قریب پانی ہر وقت موجود رہنا لازم ہے اور انھیں کُتّوں، لومڑیوں، کوّوں اور شکاری پرندوں سے محفوظ رکھنے کی بڑی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک اچھے علاقے میں فی بھیڑ تین یا چار ایکڑ زمین درکار ہوتی ہے، لیکن زیادہ خشک حصوں میں ایک بھیڑ کے لیے سال بھر کے واسطے خوراک مہیا کرنے کے لیے بیس ایکڑ تک زمین چاہیے۔ اس طرح بھیڑوں کی تعداد مرکز کے رقبے پر منحصر ہے۔ مغربی میدانوں میں عام باڑوں کا رقبہ پچاس ہزار ایکڑ کے لگ بھگ ہوتا ہے، لیکن زیادہ دور اور نیم ریگستانی علاقوں میں بعض باڑوں کا رقبہ پانچ لاکھ ایکڑ تک ہے۔

بھیڑوں کے مرکز میں اُون اتارنے کا زمانہ نہایت مصروفیت کا مہینا ہوتا ہے۔ اون اتارنے والے موٹرکاروں اور ٹرکوں میں بیٹھ کر یہاں پہنچتے ہیں اور بڑے بڑے سائبانوں میں اپنے اڈّے لگا دیتے ہیں۔ پرانے زمانے میں بھیڑوں کی اُون ہاتھوں سے اتاری جاتی تھی، لیکن آج کل بجلی سے چلنے والی قینچیاں استعمال کی جاتی ہیں۔ یہ برقی حجامتی مشین سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہوتیں۔ بعض باڑوں میں ایک دن میں تقریباً چار ہزار بھیڑوں کی اُون اتار لی جاتی ہے۔ شیڈ میں کام کرنے والے اُون کو اُٹھا کر میزوں پر رکھتے جاتے ہیں۔ یہاں اس میں سے خراب اُون کو علیحدہ کر دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد اون کے مبصر آتے ہیں جو اپنے کام میں بڑے ماہر ہوتے ہیں۔ وہ محض دیکھ کر یا چھُو کر بتا سکتے ہیں کہ یہ کس قسم کی اون ہے۔ جب اون کو علیحدہ علیحدہ درجوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے تو پھر ایک بہت بڑے شکنجے میں انھیں دبا کر ان کے بڑے بڑے بنڈل بنائے جاتے ہیں۔ یہ بنڈل روئی کے گٹھوں ہی کی طرح ہوتے ہیں۔ جوں ہی اُون اتارنے کا کام ختم ہوتا ہے، اُون اتارنے والے اپنا بوریا بستر باندھ کر جنوب کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں۔ سب سے پہلے اُون اُتارنے کا موسم شمالی حصّے میں شروع ہوتا ہے اور موسم کے مطابق جنوبی حصّے میں اُون اس کے بعد

اتاری جاتی ہے۔ جب اُون اتارنے کا کام ختم ہو جاتا ہے اور اُون کی گانٹھیں بندھ جاتی ہیں تو پھر بھیڑوں کے باڑے میں خوب خوشیاں منائی جاتی ہیں۔ اکثر ناچ ہوتے ہیں اور قریب کے دیہاتی گھوڑ دوڑ کے میدانوں میں گھوڑوں کی دوڑیں اور ہر قسم کے تفریحی کھیل ہوتے ہیں، جن میں سب حصّہ لیتے ہیں۔

آسٹریلیا کی اُون کی صنعت میں بھیڑوں کی دیکھ بھال کرنے والے کتّوں کا ذکر بھی ضروری ہے۔ یہ کتّے یورپ اور امریکا کے بھیڑوں کی رکھوالی کرنے والے کتّوں سے بہت مختلف ہیں۔ یہ بہت سمجھدار اور ہوشیار ہوتے ہیں اور اپنے مالکوں کو بہت مدد دیتے ہیں۔ ان کی ایک چھوٹی قسم زیادہ پالی جاتی ہے۔ بھیڑوں کی رکھوالی کرنے والے عام قد آور کتّوں سے یہ قد میں بہت چھوٹے ہوتے ہیں اور ان کا رنگ کچھ نیلگوں ہوتا ہے۔ ان کے کان نوکیلے اور تیز ہوتے ہیں۔ یہ کتّے کلپائی اور کولی نسل کے کتّوں کے میل سے حاصل کیے گئے ہیں۔ یہ بہت تیز لیکن حلیم اور وفادار ہوتے ہیں۔ جب بھیڑوں کو اکٹھا کیا جاتا ہے تو بہت سے کتّے مل کر کام کرتے ہیں۔ اس وقت ان کے آگے ایک کتا دوسروں کی رہنمائی کرتا ہے۔ ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ کام کے وقت یہ بھوک کی بھی پروا نہیں کرتے۔ اکثر دیہاتی میلوں میں ایسے کتّوں کی نمائش بھی ہوتی ہے۔ آقا کا اشارہ پاتے ہی یہ کتا سیکڑوں بھیڑوں کو ایک تنگ دروازے میں سے چند منٹوں میں گزار کر لے جاتا ہے۔ اور ایک بھیڑ کو بھی ادھر ادھر نہیں ہونے دیتا۔ اس قسم کے تربیت یافتہ کتّے بڑی قیمت پاتے ہیں اور باڑوں کے حدود کی رکھوالی کرنے والوں کو ان سے بڑی مدد ملتی ہے۔ یہ بھی ان سے بڑی محبت سے پیش آتے ہیں۔ کانٹوں والے علاقوں میں ان کتّوں کے پاؤں کی حفاظت کے لیے ان کو چھوٹے چھوٹے بوٹ بھی پہنائے جاتے ہیں۔

بارھواں باب

میدانوں سے آگے

آسٹریلیا کے بھیڑوں کے اکثر باڑے اور مویشیوں کے احاطے زیادہ تر کوئنزلینڈ، نیو ساؤتھ ویلز اور وکٹوریا کی ریاستوں میں برّاعظم کے مشرقی چوتھائی حصّے میں واقع ہیں۔ ان کی آبادی کا انحصار ان دریاؤں پر ہے جو کوہ فاصلِ اعظم سے نکل کر مغرب کی طرف بہتے ہیں۔ لیکن ان سے آگے بھی بہت بڑا علاقہ ہے۔ اس سرزمین کا حال اچھی طرح معلوم کرنے کے لیے ہمیں اس کے بہادر دریافت کرنے والوں کے حالات کو جاننا پڑے گا۔

فلنڈرز، برّاعظم کے تمام ساحل کا نقشہ تیار کر چکا تھا، لیکن اس کے پچاس سال بعد بھی کوئی شخص اس برّاعظم کو شمال سے جنوب یا مشرق سے مغرب کے رُخ عبور نہ کر سکا۔ بجز اس تھوڑے سے علاقے کے جو دریائے سوان کے قریب واقع ہے، اس وقت تک برّاعظم کے وسطی، شمالی اور مغربی حصّوں کا کسی کو پتا نہ تھا۔ جب قسمت آزما بہادر نوجوان اس علاقے کے حالات معلوم کرنا چاہتے تو آسٹریلیا کے معمّر سمجھدار باشندے جو جا بجا گڈریوں کا کام کرتے تھے انھیں وہاں جانے سے روکتے اور اپنی ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہتے "کبھی نہیں" جس سے اُن کا یہ مطلب ہوتا تھا کہ "ان علاقوں میں کبھی کوئی شخص نہیں پہنچ سکتا"۔

لیکن ایک نوجوان ایڈورڈ آئر ان باتوں سے ڈرنے والا نہ تھا۔ یہ چھبیس سالہ بہادر انگریز نوجوان مشرقی میدانوں میں بھیڑوں کا مالک تھا۔ "کبھی نہیں" کا لفظ اس کی لُغت میں داخل نہ تھا۔ یہ شخص یہاں کے جھاڑیوں والے علاقے کو بہت اچھی طرح سے سمجھتا تھا۔ اس نے اس پُر اسرار اندرونی علاقے کے حالات دریافت کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ وہ ایڈی لیڈ

سے ٹھیک شمال کی طرف اس مہم پر روانہ ہو گیا۔ خلیج سپنسر کے بالکل شمال میں کھارے پانی کی بہت سی جھیلوں کی وجہ سے اسے رُکنا پڑا۔ یہ جھیلیں خشک تھیں، لیکن یہاں نمک کی تہ اتنی مضبوط نہ تھی کہ اس کے اوپر سے انسان یا جانور گزر سکیں۔ ان میں سے ' سب سے' بڑی جھیل جو رقبے میں شمالی امریکا والی" اٹاہ گریٹ سالٹ لیک" سے دُگنے سے بھی بڑی ہے' آئر ہی کے نام سے موسوم ہے۔ پچھلے چند سال میں یہ جھیل نہایت پُر اسرار طریقے سے پانی سے بھر گئی ہے۔ یہ نوجوان دریافت کرنے والا اس مشکل پر کسی طرح قابو پانے کے خیال سے اور اس امید پر کہ شاید وہ اسے عبور کر سکے' آٹھ ماہ تک یہاں ٹھہرا رہا' لیکن آخرکار اس نے اس ارادے کو ترک کر دیا اور شرقاً غرباً راستہ اختیار کیا۔

فلنڈرز کے نقشوں پر اس کی تحریروں سے آئر کو یہ معلوم تھا کہ گریٹ آسٹریلوی بائیٹ کے ساحل کے ساتھ ساتھ ریت کے ٹیلوں کے دامن میں زمین کے کھودنے سے پانی مل جاتا ہے۔ اس لیے سیدھے مغرب کی طرف جانے کے بجائے آئر ساحل کے ساتھ ساتھ روانہ ہوا۔ جہاں اسے پانی کا ملنا یقینی تھا۔ بڑے جزیرہ نما کو عبور کرنے کے بعد آئر پانی کے ایک مرکز پر پہنچا جو ہماری موجودہ خلیج فاؤلر پر واقع تھا۔ یہاں اس نے اپنا کیمپ قائم کیا۔ شروع میں تین مرتبہ غلط روانگیوں کے بعد وہ واپس آتا جاتا رہا اور پھر اپنی ساری جماعت کو ایڈی لیڈ واپس بھیج دیا۔ اب اس کے ساتھ اس کا ایک دوست جس کا نام باکسٹر تھا اور تین آسٹریلیا کے باشندے جوئی' یاری اور ڈِلی تھے۔ دس گھوڑوں پر انھوں نے پانی کے مٹکے' نمکین گوشت اور سائنس کے آلات لاد دیے اور نو بھیڑوں کو اپنے آگے آگے ہانکتے ہوئے' وہ ایلبنی کی چھوٹی بستی کی طرف ساحل کے ساتھ ساتھ ایک ہزار میل کے سفر پر پیدل روانہ ہو گئے۔ انھیں اس بات کا علم نہ تھا۔ لیکن اس تمام سفر کے دوران میں ساحل ایک سو سے اڑھائی سو فٹ تک بلند اور چٹانی تھا اور کسی جگہ بھی کوئی ندی یا دریا ساحل کو کاٹ کر سمندر میں نہ گرتا تھا۔ ہر جگہ سمندر کی لہریں ساحل کی کڑی چٹانوں سے ٹکراتی نظر آتی تھیں۔ وہ ساحلی چٹانوں کے ساتھ ساتھ

خشک جھاڑی دار علاقے میں سفر کرتے رہے۔ کئی جگہ ریگستان کی طرف سے آنے والی گرم ہوا کے ساتھ اس قدر ریت اور مٹی اڑتی تھی کہ انھیں کچھ بھی دکھائی نہ دیتا۔ یہاں کی تکلیف دہ مکھیاں بھی انھیں سخت پریشان کرتیں۔ اس تمام سفر میں سمندر ان کے بائیں طرف تھا اور وہ مغرب کے رُخ چلے جاتے تھے۔ درجۂ حرارت سایے میں بھی ایک سو فارن ہائٹ سے زیادہ تھا، لیکن اکثر وہ دھوپ میں سفر کرتے تھے۔

سات دن کے بعد وہ ریت کے ایک ٹیلے کے پاس پہنچے جس کے دامن میں زمین کھودنے سے انھیں پانی مل گیا۔ آئر اکیلا آگے چلا گیا اور دوسرے وہاں آرام کرنے کے لیے ٹھہر گئے۔ اس جگہ سے ۱۳۵ میل آگے اسے ایک اور ریت کا ٹیلا ملا۔ وہاں سے وہ واپس آگیا اور باکسٹر اور آسٹریلیا کے باشندوں کو ساتھ لے کر دوبارہ روانہ ہوا۔ اس طرح افتاں خیزاں وہ اس ریگستان کو عبور کرتے رہے۔ اب ریت کے ٹیلے بہت کم تھے۔ تھوڑا تھوڑا کرکے انھوں نے اپنے سامان کو ہلکا کرنا شروع کیا۔ بھیڑوں کو ذبح کرکے کھا لیا۔ گھوڑے کچھ مر گئے اور جو زیادہ کمزور ہو گئے انھیں ان کے حال پر چھوڑ دیا گیا۔ اب وہ پانی کے لیے سخت بیتاب تھے۔ آئر صبح کے وقت اسفنج سے شبنم کے قطرے اکٹھے کرتا اور ہر ایک شخص اس سے اپنے ہونٹ تر کر لینے پر اکتفا کرتا۔ ایک شام جب سخت طوفان آنے والا تھا وہ ایک مسطح چٹان پر ٹھہر گئے۔ انھیں امید تھی کہ بارش کا پانی چٹان کے سوراخوں میں جمع ہو جائے گا۔ اس رات سخت حبس رہا اور بارش نہ ہوئی۔ جب آئر گھوڑوں کی دیکھ بھال میں مصروف تھا تو جوئی اور یاری نے رائفل سے باکسٹر کو ہلاک کر دیا اور باقی ماندہ خوراک کا سامان لے کر بھاگ گئے۔ آئر میں اتنی سکت بھی نہ تھی کہ وہ باکسٹر کو دفن کر سکتا لہٰذا اُس نے اپنے مظلوم رفیق کی نعش کو ایک کمبل میں لپیٹ کر چٹان پر چھوڑ دیا۔

آئر اور ولی جس طرح ممکن ہوا آگے بڑھتے گئے۔ کچھ دن تک جوئی اور یاری بھی ان

کے پیچھے پیچھے رہے۔ انھوں نے وِلّی کو اپنے ساتھ ملانے کی بڑی کوشش کی، لیکن وِلّی وفادار ثابت ہوا۔ اور اس نے ان کی طرف ذرا بھی التفات نہ کیا۔ آئر رات کو رائفل اپنے بازو کے نیچے رکھ کر سوتا تھا۔ آخرکار جوئی اور یاری ان سے علیحدہ ہو گئے۔ اب یہ لوگ ایسی جگہ پہنچ چکے تھے، جہاں سے واپس ہونا مشکل تھا۔ آئر آگے بڑھتا چلا گیا۔ ان کی منزلِ مقصود ابھی تین سو میل دور تھی اور کسی ندی یا درخت کا نشان تک نہ تھا۔ ایک صبح یکایک آئر کو ایک جزیرے کے پیچھے سمندر میں کسی جہاز کے مستول دکھائی دیے۔ اس نے فوراً آگ جلائی جسے دیکھ کر ایک کشتی ان کے قریب پہنچی۔ یہ وھیل مچھلی پکڑنے والا جہاز تھا جس کا نام مسس سپی تھا۔ آئر نے بارہ دن اس جہاز پر گزارے اور اس عرصہ میں اس کے جسم میں کچھ توانائی آگئی۔ وہ واپس جا سکتا تھا، لیکن اس نے اپنے سفر کو مکمل کرنے کا مصمم ارادہ کیا تھا۔ ایک دن وہ دوبارہ وِلّی کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ اب ان کے پاس خوراک کا کافی سامان تھا، لیکن ابھی تک وہ البینی سے ڈھائی سو میل دُور تھے۔ یہاں سے ایک مہینے کے مزید سفر کے بعد وہ لڑکھڑاتے ہوئے اپنی منزلِ مقصود پر پہنچ گئے۔ آئر پہلا شخص تھا جس نے آسٹریلیا کو مشرق سے مغرب تک عبور کیا۔

اب تک آسٹریلیا کو جنوب سے شمال کے رُخ میں کسی نے عبور نہ کیا تھا۔ چارلز سٹرٹ جس نے کئی سال پہلے دریائے مرے دریافت کیا تھا، اب اس مہم کے لیے تیار ہو گیا۔ وہ اس غرض کے لیے ایڈی لیڈ سے ایک بڑی جماعت کے ساتھ روانہ ہوا جس میں بارہ آدمی، تین بیل گاڑیاں، گیارہ گھوڑے، تیس بیل، تین سو بھیڑیں اور جاڑے کا بہت سا سامان تھا۔ نمکین جھیلوں سے بچنے کے لیے وہ شمال مشرق کی طرف روانہ ہوئے۔ یہاں انھوں نے پہاڑوں کے ایک سلسلے کو دیکھا جو سمندر میں ایک جزیرے کی طرح کھڑے دکھائی دیتے تھے لیکن افسوس! پانی کا نشان تک نہ تھا۔ سٹرٹ نے اس پہاڑ کو بیریر رینج (کوہ حائل) کا نام دیا۔ اس کی مغربی ڈھلانوں کے ساتھ ساتھ سفر کرتا ہوا وہ ایک ایسی جگہ

پہنچ گیا، جہاں ایک ندی بہتی تھی۔ یہاں انھوں نے اپنا کیمپ بنا لیا۔

سٹرٹ کو جلد ہی معلوم ہوگیا کہ یہ سال جو اس نے اپنی اس مہم کے لیے چنا تھا، بدترین خشک سالی کا تھا۔ ان کے راستے میں جس قدر چشمے اور پانی کے مرکز ملے، وہ سب خشک ہو چکے تھے۔ اب وہ چھ مہینے تک اس کیمپ میں ٹھہرنے پر مجبور ہو گئے۔ جس ندی کے متعلق اس نے یہ خیال کیا تھا کہ یہ سارا سال بہنے والی ہے، آہستہ آہستہ اس میں پانی کی کمی ہوتی گئی اور آخرکار سوائے کیچڑ کے اور کچھ نظر نہ آیا۔ موسم سخت گرم تھا۔ سٹرٹ نے اپنے حالات کے سلسلے میں بعد میں لکھا۔ "زمین تین چار فٹ کی گہرائی تک سخت گرم تھی۔ اور سخت حرارت کی وجہ سے ہمارے بکسوں کے پیچ ڈھیلے ہو کر باہر نکل آئے۔ سینگ کے بنے ہوئے دستے اور کنگھیاں سکڑ کر چھلکا بن گئیں۔ پنسلوں کا سرمہ پگھل کر نکل گیا، ہمارے سروں کے بال اور بھیڑوں کی اون بڑھنے سے رک گئی اور ہمارے ناخن شیشے کی طرح خشک اور بھربھرے ہو گئے۔

جلد ہی وہاں کے مقامی پرندے بھی یہ جگہ چھوڑ کر چلے گئے۔ سٹرٹ کا نائب اسی جگہ مرگیا اور انھوں نے ایک اونچے پہاڑ کے دامن میں اسے دفن کر دیا اور اس پہاڑی کا نام ماؤنٹ پول رکھا۔ جب آخرکار بارش ہوئی تو سٹرٹ نے اپنی پارٹی کو واپس ایڈی لیڈ بھیج دیا اور خود مغرب کی طرف آگے روانہ ہو گیا۔ ایک نمکین جھیل کے قریب پہنچ کر، وہ شمال مغرب کی طرف مڑا۔ اس نے خیال کیا کہ یہ وہی جھیل ہے، جس کی وجہ سے آئر کو رکنا پڑا تھا، لیکن درحقیقت یہ ایک دوسری جھیل تھی۔ بارش چند چھینٹوں سے زیادہ نہ ہوئی اور دوبارہ خشک موسم شروع ہو گیا۔ اس دفعہ یہ پہلے سے بھی زیادہ سخت تھا۔ وہ بہت سے خشک دریاؤں کے راستوں میں سے گزرا جو اب دیکھنے میں دریا کی گزرگاہیں نہیں معلوم ہوتے تھے۔ اسی طرح سفر کرتا ہوا، وہ ایک پتھریلے ریگستان میں پہنچا جس کے پتھر ہوا کی تندی سے فرسودہ اور ہموار ہو چکے تھے۔ یہ صحرا اب اسی کے نام سے موسوم ہے۔ یہاں سے آگے وہ ایسے علاقے

میں پہنچا، جہاں ریت کے ٹیلوں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ آخر کار وہ ایک ایسے مقام پر پہنچ گیا جس کو بتانے کے لیے صرف اس کا طول البلد اور عرض البلد ہی بتایا جا سکتا تھا اور اس کے سوا اس کو ظاہر کرنے کے لیے اور کسی قسم کا کوئی نشان موجود نہ تھا۔ یہ جگہ عرض البلد ۲۴°۴۰ جنوبی اور طول البلد ۱۳۸° مشرقی پر تھی۔ یہاں سے وہ اپنے کیمپ کو روانہ ہوا جو اس جگہ سے پانچ سو میل کے فاصلے پر تھا۔ راستے میں اس نے کوپرز کریک کو بھی دریافت کیا جو ایک بہت بڑا دریا معلوم ہوتا تھا لیکن جو آگے جا کر گھاس کے میدانوں میں خشک ہو جاتا ہے۔ اس سے تھوڑا آگے جا کر اس نے ایک پہاڑ دیکھا جسے اس نے ماونٹ ہوپ لیس (کوہ یاس) کا نام دیا، کیونکہ یہاں پہنچ کر اس نے محسوس کیا کہ وہ اور آگے نہیں جا سکتا۔ یہاں کسی جاندار چیز کا نشان نہ تھا اور یہاں اس نے آسٹریلیا کو عبور کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔

سٹرٹ کے پاس خوراک ختم ہو گئی تھی اور اس کی صحت بھی جواب دے چکی تھی، لیکن وہ آہستہ آہستہ واپس کیمپ میں پہنچ گیا۔ یہاں سے اس کو ایک بیل گاڑی میں منزل بہ منزل واپس ایڈی لیڈ لایا گیا، لیکن اس کی صحت اس قدر خراب ہو چکی تھی کہ وہ دوبارہ دریافت کرنے کی ہمت نہ کر سکا۔

البتہ جہاں تک وہ پہنچا تھا اس سے آگے دریافت کا کام دوسروں نے جاری رکھا۔

تیرھواں باب

کبھی نہ طے ہونے والی سرزمین

سٹرٹ کی ناکامی کے باعث اس کے بعد پندرہ برس تک کسی اور دریافت کرنے والے کو برّاعظم کے وسطی ریگستان کو دریافت کرنے کا حوصلہ نہ ہوا۔ اس عرصے میں علم طبیعیات کا ماہر ایک جرمن نوجوان، لڈوگ یشرڈ آسٹریلیا پہنچ کر، برسبین کے قریب خلیج مارٹن میں تین برس، یہاں کی مچھلیوں اور پھولوں کی قسموں کو معلوم کرنے میں صرف کر چکا تھا۔ جب شمال کی طرف ایک مہم بھیجنے کی تجویز ہوئی تو یشرڈ نے بطور ماہر علم طبیعیات ان کے ساتھ جانے کی درخواست کی، لیکن اس مہم کے روانہ ہونے میں بہت دیر ہو گئی اور کافی انتظار کرنے کے بعد یشرڈ اپنی مہم پر تنہا روانہ ہو گیا۔

خوش قسمتی سے وہ موجودہ کوئینز لینڈ کے شمالی حصّے کے میدانوں، پہاڑوں اور دریاؤں کو عبور کرنے میں کامیاب ہو گیا اور آخرکار خلیج کارپینٹریا میں پہنچ گیا۔ جو کام آئر اور سٹرٹ کی مہموں سے نہ ہو سکا تھا، اس نے کر دکھایا، اور اب سکوٹر اپنی بیل گاڑیوں کے ساتھ بھیڑوں کے ریوڑ اور مویشیوں کے گلّے ساتھ لے کر اس نئی زمین میں پہنچ گئے۔

اس مہم میں اس جرمن نوجوان کو اس قدر شہرت حاصل ہوئی کہ اسے برّاعظم کو عبور کرنے کے لیے ایک مہم کی تیاری کے واسطے روپیہ حاصل کرنے میں دقّت نہ ہوئی، چونکہ اسے اس جھاڑیوں والی زمین کا زیادہ تجربہ نہ تھا، اس لیے تین چار سو میل جانے کے بعد ہی اس کا تمام سامان اور ذخیرہ ختم ہو گیا، لیکن وہ اس سے مایوس نہ ہوا اور ایک تیسری مہم پر پھر شمال مغرب کی طرف روانہ ہوا۔ اس کے بعد لڈوگ یشرڈ کے متعلق کچھ معلوم نہ ہو سکا۔

اس کا سازوسامان، اس کے گھوڑے، بھیڑیں، بیل گاڑیاں اور جس قدر آدمی اس کے ساتھ تھے سب کے سب اس نامعلوم سرزمین میں ہمیشہ کے لیے کھو گئے۔ بیسیوں دریافت کرنے والے، جن میں سے اکثر بہت قابل، محنتی اور تجربہ کار افراد تھے، ان اوّلین تحقیق کرنے والوں کے بعد ان کے دریافت کردہ علاقوں میں مزید معلومات حاصل کرنے کے لیے جاتے رہے، لیکن اب سکاٹ لینڈ کے ایک نوجوان میکڈوال اِسٹوارٹ کے دل میں برّاعظم کو عبور کرنے کی زبردست خواہش پیدا ہوئی، وہ چاہتا تھا کہ اس کامیابی کا سہرا اس کے سر رہے۔ وہ اس سے پہلے سٹرٹ کے ساتھ ملک کے اندرونی حصّوں میں سفر کر چکا تھا۔ یہ نوجوان ایک چھوٹے سے ٹٹو پہ سوار ہو کر اور ایک مختصر جماعت اپنے ساتھ لے کر پانچ بار شمال کی طرف روانہ ہوا۔ ہر بار ان مہموں پہ چھ ماہ سے ایک سال تک وقت صرف ہوا اور ہر بار، وہ شمالی ساحل سے تھوڑا سا قریب تر ہوتا رہا۔ چوتھی کوشش میں اسے نمکین جھیلوں میں سے ایک راستہ مل گیا، درحقیقت، یہاں پانچ چھ الگ الگ جھیلیں تھیں جن کے بیچ میں سے اس نے راستہ ڈھونڈ لیا۔ یہاں سے گزر کر وہ برّاعظم کے عین وسط میں ایک پہاڑ پہ پہنچا جو ساحلوں سے ایک ہزار میل دُور تھا۔

یہ ویران پہاڑ ایک پتھریلی سطح مرتفع میں واقع تھا۔ اسٹوارٹ اس کے اوپر چڑھ گیا اور ایک چھڑی پہ برطانیہ کا جھنڈا لگا کر پہاڑ کی چوٹی پہ بلند کر دیا۔ وہ اپنے رسالے میں لکھتا ہے کہ "ہم نے جھنڈا گاڑنے کے بعد تین بار مرحبا کا نعرہ لگایا۔ یہ جھنڈا یہاں کے رہنے والوں کے لیے اس بات کی نشانی تھا کہ عنقریب اس سرزمین میں آزادی، تہذیب، تمدّن اور عیسائی مذہب پہنچنے والا ہے۔" اس نے اس پہاڑ کا نام دریافت کرنے والے نامراد سٹرٹ کے نام پہ "مونٹ سٹرٹ" رکھا، لیکن بعد میں جلد ہی یہ نام بدل کر مونٹ سٹوارٹ رکھ دیا گیا۔

۱۸۶۱ء کے آخر میں وہ برّاعظم کو عبور کرنے کی آخری اور کامیاب مہم پہ روانہ ہوا۔

اس دفعہ آسٹریلیا کے جو اصلی باشندے اس کے ساتھ تھے، زیادہ وفادار نہ ثابت ہوئے اور ان میں سے دو انھیں چھوڑ کر بھاگ گئے۔ کچھ گھوڑے بھی راستے میں مر گئے، لیکن وہ اس عجیب علاقے میں جسے اب شمالی علاقہ کہتے ہیں، آگے بڑھتا چلا گیا۔ یہاں اس نے نہایت خوبصورت پرندوں کے غول کے غول دیکھے جو اس سے پہلے کسی سفید فام نے نہ دیکھے تھے۔ کنگارو، بہت بڑی بڑی جسامت کی چھپکلیاں، اور نئی قسم کے بہت سے درخت اور پھول بھی یہاں ملے۔ چیونٹیوں کے بنائے ہوئے ٹیلے، جو یہاں سب سے پہلے گُگ نے دیکھے، بہت بلند تھے۔ ان میں سے بعض پندرہ فٹ اونچے تھے اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا یہ کسی کلیسا کے خوبصورت نمونے ہیں۔

جلد ہی یہ مہم منطقہ حارہ کے علاقے میں داخل ہو گئی۔ یہاں نہایت بلند بانس، گھنی جھاڑیاں اور ایک خاص قسم کے بلوط کے جنگل تھے۔ اسٹوارٹ اپنے ایک ساتھی کے ساتھ آگے بڑھتا چلا گیا۔ جوں ہی وہ ان جھاڑیوں سے باہر نکلے تو سامنے سمندر نظر آیا۔ وہ فوراً واپس اپنی جماعت کے پاس پہنچے۔ اسٹوارٹ کا ساتھی بہت خوشی سے چلایا "سمندر! سمندر!!" وہ تمام آگے کی طرف بھاگے اور بچوں کی طرح پانی میں کود کر خوشی سے چلّانے لگے۔ فوراً برطانیہ کا جھنڈا جس پر اسٹوارٹ کا نام بھی کڑھا ہوا تھا گاڑ دیا گیا۔ وہ سب ایک دوسرے کو مبارکباد دینے لگے۔ تقریریں ہوئیں اور انھوں نے ملکہ وکٹوریا اور پرنس آف ویلز کے نام کے نعرے لگائے۔

برّاعظم کو عبور کرنے میں آٹھ مہینے صرف ہوئے۔ اُن کے کپڑے پھٹ چکے تھے اور خوراک کا سامان ختم ہو چکا تھا۔ اسی حالت میں وہ دو ہزار میل کے واپسی سفر پر روانہ ہو گئے۔ اسٹوارٹ راستے میں بیمار ہو گیا اور اسے دو گھوڑوں کی مدد سے ایک سٹریچر پر لے جایا گیا، گھوڑے بھی مر گئے اور آسٹریلیا کے باشندوں نے ان پر حملے کیے۔ اسٹوارٹ مفلوج ہو گیا اور کچھ عرصے کے لیے اس کی بینائی بھی جاتی رہی۔

وہ چار مہینوں کے بعد واپس ایڈی لیڈ پہنچے۔ ان کے اس کارنامے پر ان کو پانچ ہزار ڈالر کا انعام ملا اور رائل جیوگرافیکل سوسائٹی نے انھیں ایک سونے کا تمغا بھی پیش کیا۔

اس کے بعد اسٹوارٹ کی صحت دوبارہ ٹھیک نہ ہوئی اور وہ تین سال بیمار رہ کر مرگیا۔ اس نے بہت بڑا کام کیا تھا۔ اس واقعے کے صرف دس برس بعد ایڈی لیڈ سے شمالی ساحل تک ٹیلی گراف لائن لگ گئی اور یہاں سے آگے بحری تار کے ذریعے سے اسے انگلستان کے ساتھ بھی ملا دیا گیا۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران میں جنرل ڈوگلس میکارتھر نے جاپان کے خلاف مہم کے سلسلے میں فوجوں اور سامانِ جنگ کو شمال تک پہنچانے کے لیے علاقۂ شمالی میں ایک سڑک بنوائی۔ اس سڑک کا ایک حصہ چھ سو میل تک لگاتار بغیر کسی موڑ کے چلا گیا ہے، اور یہ ساری سڑک تقریباً ایک ہی سطح پر واقع ہے۔

اپنی انتہائی کوشش کے باوجود اسٹوارٹ برّاعظم کو شمال سے جنوب تک عبور کرنے میں پہلا شخص نہ ہو سکا۔ اگرچہ اسے یہ معلوم نہ تھا، لیکن ایک اور مہم اس سے تقریباً ایک سال پہلے شمالی ساحل پر پہنچ چکی تھی جب کہ اسٹوارٹ ابھی روانہ ہی ہو رہا تھا۔ اس مہم کے آدمی اسٹوارٹ سے بھی زیادہ حوصلہ مند تھے۔ اس کا رہنما رابرٹ اوہارا برک (باشندۂ آئرلینڈ) اور انگلستان کے جنوبی مغربی حصے کے ولیم جان ولیز تھے۔ یہ دس سفید آدمی جن میں ایک ڈاکٹر، ایک علم طبیعیات کا ماہر، ایک ماہر طبقات الارض اور تین ساربان تھے پچیس اونٹوں کے ساتھ میلبورن سے روانہ ہوئے۔ اس مہم کے لیے اونٹ مصر سے منگوائے گئے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ سفر کرتے ہوئے ایک ہزار میل طے کرنے کے بعد اس جگہ پہنچے جہاں اسٹرٹ نے اپنا ابتدائی کیمپ بنایا تھا، لیکن اس عرصے میں اس علاقے کے متعلق کافی معلومات حاصل ہو چکی تھیں اور یہاں کئی مویشی پالنے والے بھی پہنچ چکے تھے، جن کی رائے سے اس نے ایک اور راستہ اختیار کیا۔

برک نے آگے بڑھ کر بہ مقام کوپرز کریک ہراولی کیمپ قائم کر لیا اور وہاں سامان اور امداد کا انتظار کرنے لگا، لیکن جب کئی ہفتے گزر گئے تو وہ بے تاب ہو گیا۔ اس نے ملک کے اندرونی حصّے میں پیش قدمی کر کے اسے ہر قیمت پر عبور کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ چنانچہ اپنا بہت سا سامان، ایک شخص کے پاس، جس کا نام "براہے" تھا چھوڑ کر، برک، ولز نیز دو اور آدمی اونٹوں پر سوار ہو کر شمال کی طرف روانہ ہو گئے۔ ریگستان کا طویل سفر طے کرنے کے بعد وہ ایک ندی پر پہنچے اور اس کے ساحل کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے ایک دریا پر پہنچ گئے۔ اب وہ خلیج کارپینٹریا کے مغربی کنارے پر تھے۔

چونکہ اب ان کی خوراک تقریباً ختم ہو چکی تھی اس لیے انھیں یہاں سے واپس ہونا پڑا۔ راستے میں اس جماعت کا ایک شخص مر گیا۔ برک، ولز اور ان کا تیسرا ساتھی، سب، اس جھاڑیوں والے علاقے کے حالات سے بالکل بے خبر تھے۔ اس وجہ سے انھیں اس ویران سرزمین میں سفر کرتے ہوئے سخت تکلیف اٹھانی پڑی، اکثر وہ باؤ باب یا بوتل نما درختوں کے قریب ہوتے ہوئے بھی پیاسے رہے، کیونکہ انھیں یہ علم نہ تھا کہ وہ اس سے پانی حاصل کر سکتے ہیں۔ آخر کار وہ جوں توں اپنے ابتدائی کیمپ میں پہنچ گئے۔ اتفاق کی بات کہ براہے چار مہینے تک ان کا انتظار کرنے کے بعد آسٹریلوی باشندوں کے "تنگ کرنے سے اور خوراک کی کمی کے باعث ان کے وہاں پہنچنے سے صرف سات گھنٹے پہلے وہاں سے روانہ ہو چکا تھا۔ وہ ان کی واپسی کے متعلق مایوس ہو چکا تھا اور مدد کے لیے کہیں اور پہنچنا چاہتا تھا۔ یہاں سے روانہ ہونے سے پہلے، اس نے زمین میں سوراخ کر کے کچھ خوراک اور ایک خط دبا دیا تھا، اور اس کی اوپر کی زمین کو ہموار کر دیا تھا تاکہ آسٹریلوی لوگ اسے نکال نہ سکیں۔ قریب کے ایک کولی باہ درخت کے تنے پر اس نے یہ لفظ بھی کھود کر لکھ دیا تھا۔ "کھودو" تینوں ناتواں و مضمحل دریافت کرنے والے اس اشارے کو نہ سمجھ سکے اور انھیں تجربہ بھی نہ تھا کہ اس بات کا اندازہ کر سکیں کہ کیمپ کو حال ہی میں چھوڑا گیا ہے۔ چنانچہ وہ

براہے کے پیچھے پیچھے روانہ ہوئے۔ برک اور ولز اب ایک مایوسی کی حالت میں اور کسی نامعلوم جذبے کے تحت سٹرٹ کے ماؤنٹ "ہوپ لیس" (کوہ یاس) کی طرف روانہ ہو گئے۔ یہاں وہ کچھ دنوں تک بیج اور مچھلیاں کھا کر زندہ رہے جو کچھ مہربان آسٹریلوی انھیں پانی کے چشموں میں سے پکڑ کر لا دیتے رہے۔ اس کے بعد وہ کچھ عرصہ ریگستان میں گھومتے پھرے اور یہیں برک اور ولز پیاس سے مر گئے۔ تیسرا آدمی ایک آسٹریلوی قبیلے کے ساتھ مل کر پاگلوں کی طرح ادھر ادھر ان کے ساتھ گھومتا رہا۔ یہاں تک کہ ڈھونڈنے والی ایک جماعت کو مل گیا۔

ان حالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ سفید نسل کے لوگوں نے وسطی آسٹریلیا کو کیسے دریافت کیا، اور انگریزی زبان میں آسٹریلیا کو "ناقابلِ انکشاف سرزمین" کا لقب کیوں دیا گیا۔

چودھواں باب

پانی ـــــ گوہرِ نایاب

اگرچہ دریافت کرنے والوں کو اس بات کا علم نہ تھا، لیکن ان صحراؤں کے نیچے بہت گہرائی میں پانی موجود تھا۔ کوئینز لینڈ کے بہت سے مشرقی حصے اور ساؤتھ آسٹریلیا اور نیو ساؤتھ ویلز کے علاقوں میں زمین کے نیچے موج زن پانی کا ایک وسیع ذخیرہ موجود ہے۔ یہ علاقہ جہاں زمین کے نیچے چھپا ہوا پانی اس طرح موجود ہے رقبے میں ساڑھے چھ لاکھ مربع میل سے بھی زیادہ ہے، اور یہ دنیا میں اس قسم کا سب سے بڑا رقبہ ہے۔ یہ پانی کوہ فاصلِ اعظم کی ڈھلانوں میں زمین کے اندر داخل ہو جاتا ہے اور زمین کے نیچے ہی نیچے مختلف گہرائیوں میں بہتا ہے۔ زمین میں گہرے سوراخ بنانے سے یہ پانی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس غرض کے لیے بعض اوقات پانچ ہزار فٹ گہرے سوراخ بنائے گئے ہیں۔ یہ پانی خود بخود باہر نکلتا ہے اور سخت گرم ہوتا ہے۔ اگرچہ کئی قسم کی معدنی چیزوں کے ملے ہونے کی وجہ سے یہ پانی کڑوا یا نمکین ہوتا ہے لیکن بھیڑوں اور مویشیوں کے لیے بہت مفید ہے۔ بعض سوراخوں میں سے ایک دن میں دس لاکھ گیلن پانی نکلتا ہے۔ یہ پانی آبپاشی کے لیے ناکافی ہے اور کھارا ہونے کی وجہ سے فصلوں میں بھی استعمال نہیں ہو سکتا۔ یہ صرف جانوروں کے استعمال میں آتا ہے۔

زمین کے نیچے اس پانی کے ذخیرے کی دریافت کے بعد مویشی پالنے والے دُور قلبِ صحرا تک پہنچ گئے یعنی جہاں تک ان کی بھیڑوں اور مویشیوں کے گزارے کے لیے تھوڑی بہت روئیدگی مل سکتی تھی۔ اس وقت بھی سب سے بڑا مسئلہ قحط سالی تھا۔ کسی سال جب سطحِ زمین پر ہر قسم کی روئیدگی ختم ہو جاتی تو بھیڑوں اور مویشیوں کی خوراک

کے لیے کچھ نہ مل سکتا تھا۔ اُس وقت یہ دُور کے علاقے بالکل بے کار رہ جاتے تھے۔ مثلاً ۵۲ - ۱۹۵۱ء میں ایک تباہ کن قحط سالی کی وجہ سے، اس علاقے میں ایک لاکھ کے قریب بھیڑیں اور مویشی موت کا شکار ہو گئے۔ اس وقت پانی کی کوئی کمی نہ تھی، لیکن بارش نہ ہونے سے چراگاہوں میں گھاس اور روئیدگی ختم ہو چکی تھی۔

ان مشکلات کے باوجود آسٹریلیا کے وسطی ریگستان کے مشرقی کنارے کے قریب بہت سے جفاکش کسان اور مویشی پالنے والے آباد ہیں جو یہاں فوارے دار کنوؤں سے پانی حاصل کرتے ہیں۔ ان کے یہ جانوروں کے احاطے ایک دوسرے سے سیکڑوں میل دور ہیں اور انھیں بہت تنہائی کی زندگی بسر کرنی پڑتی ہے۔ ایسے مراکز پر اکثر چرواہے اور گڈریے آسٹریلیا کے حبشی ہیں۔ آج سے ایک نسل پہلے یہاں زندگی کافی مشکل تھی، کیونکہ اکثر ان دور دراز مقامات پر اگر کوئی حادثہ ہو جاتا یا کوئی بہت زیادہ بیمار ہو جاتا تو اسے کسی قسم کی امداد نہ پہنچ سکتی تھی۔

پہلی جنگِ عظیم کے کچھ عرصہ بعد ہی، ایک پریسبیٹرین[1] پادری ڈاکٹر جان فلن نے ایک ایسا نظام قائم کیا، جس سے دور دراز کے مرکزوں کو بھی ہوائی جہاز کے ذریعے سے طبی امداد پہنچائی جا سکتی تھی۔ یہ شخص تمام آسٹریلیا میں "اندرونی ڈاکٹر فلن" کے نام سے مشہور ہے۔ تمام مرکزوں کے مالکوں کو پیڈل سے چلنے والے ریڈیو ٹرانسمٹر مہیا کیے گئے، جن کے ذریعے سے وہ آسٹریلیا کے وسطی حصے میں ایلس سپرنگز کے ایک مرکزی اوپیریٹر سے بات کر سکتے تھے۔ ایلس سپرنگ میں ہر وقت ایک ڈاکٹر موجود رہتا تھا جو ان مویشی پالنے والوں کو ابتدائی طبی امداد کی ہدایات دیتا تھا اور اگر مریض زیادہ بیمار ہوتا تو وہ ہوائی جہاز سے وہاں پہنچ جاتا۔ آج کل پیڈل سے چلنے والے ریڈیو کے بجائے بیٹری سے کام کرنے والے ٹرانسمٹر سیٹ استعمال کیے جاتے

---

[1] عام پادریوں کی حکومتِ کلیسا کے طریقِ حکمرانی کا پیرو۔ پریسبیٹرین مذہب کا رکن۔

ہیں جو خاص طور پر اسی غرض کے لیے تیار کیے گئے ہیں۔ یہ بہت ہلکے ہوتے ہیں اور آسانی سے جہاں چاہیں لگائے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ ٹھیکیدار اور دوسرے ایسے لوگ جو اکثر ادھر ادھر چلتے پھرتے رہتے ہیں، اسے آسانی سے استعمال کر سکتے ہیں اور ان کے ذریعے سے ضرورت پڑنے پر ڈاکٹر کو بلایا جا سکتا ہے۔

فلائنگ ڈاکٹر یا ہوائی جہاز سے پہنچنے والے ڈاکٹروں کا طریقہ شروع ہی سے بڑا کامیاب رہا۔ اس وقت آسٹریلیا کے اندرونی حصے میں اس قسم کے بارہ ریڈیو اسٹیشن ہیں۔ جن میں سے ہر ایک تقریباً گیارہ سو مربع میل کے علاقے میں کام دیتا ہے۔ اب ہر بڑے مرکز میں جہاز کا اڈا، ریڈیو پیغام رساں اور پیغام گیر اور ایک دوا خانہ ہوتے ہیں۔ اس دواخانے میں دواؤں کو ایک خاص طریقے کے مطابق نمبر دے دیے جاتے ہیں اور جب ریڈیو کے ذریعے سے بیمار کی کیفیت بتائی جاتی ہے تو ڈاکٹر دوا کا نمبر بتا دیتا ہے۔ زیادہ شدید قسم کے امراض میں وہ پرواز کر کے اس مرکز میں پہنچ جاتا ہے۔ ایمبولینس گاڑی کی طرح اس کے جہاز میں طبی ضرورت کی تمام چیزیں موجود ہوتی ہیں۔

اب دور دراز علاقوں میں رہنے والے اکثر سکوٹروں کے پاس چھوٹے چھوٹے ذاتی ہوائی جہاز ہوتے ہیں، جو تھوڑے تھوڑے فاصلوں کے درمیان سفر کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ ان چیزوں سے اب یہاں زندگی اس قدر آرام دہ ہو گئی ہے کہ اوّلین دریافت کرنے والے، کبھی اس کا تصوّر بھی نہ کر سکتے تھے۔

آسٹریلیا میں پانی حکومت کی ملکیت سمجھا جاتا ہے۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے، ایسے خشک ملک میں کسی شخص کو یہ اختیار نہیں ہونا چاہیے کہ وہ اپنے ذاتی فائدے کے لیے اس قیمتی چیز کا ناجائز استعمال کر سکے جو انسانوں اور جانوروں کی زندگی کے لیے اس قدر ضروری ہے۔ ساحلی علاقوں کی زمین کی ملکیت کے متعلق قوانین یہاں اوّلین دریافت کرنے والوں کے زمانے ہی سے چلے آتے ہیں، جو لوگ اپنی بھیڑوں کے ریوڑوں اور مویشیوں کے گلّوں کو لے کر

ان علاقوں میں سے گزرتے تھے، وہ راستے میں جہاں بھی پانی ملتا اسے حاصل کرنا اپنا حق سمجھتے تھے، چونکہ اکثر یہ پانی ایسی جگہ موجود ہوتا تھا جو دوسروں کی ملکیت ہوتی، اس لیے اس قسم کے قوانین کی ضرورت تھی۔

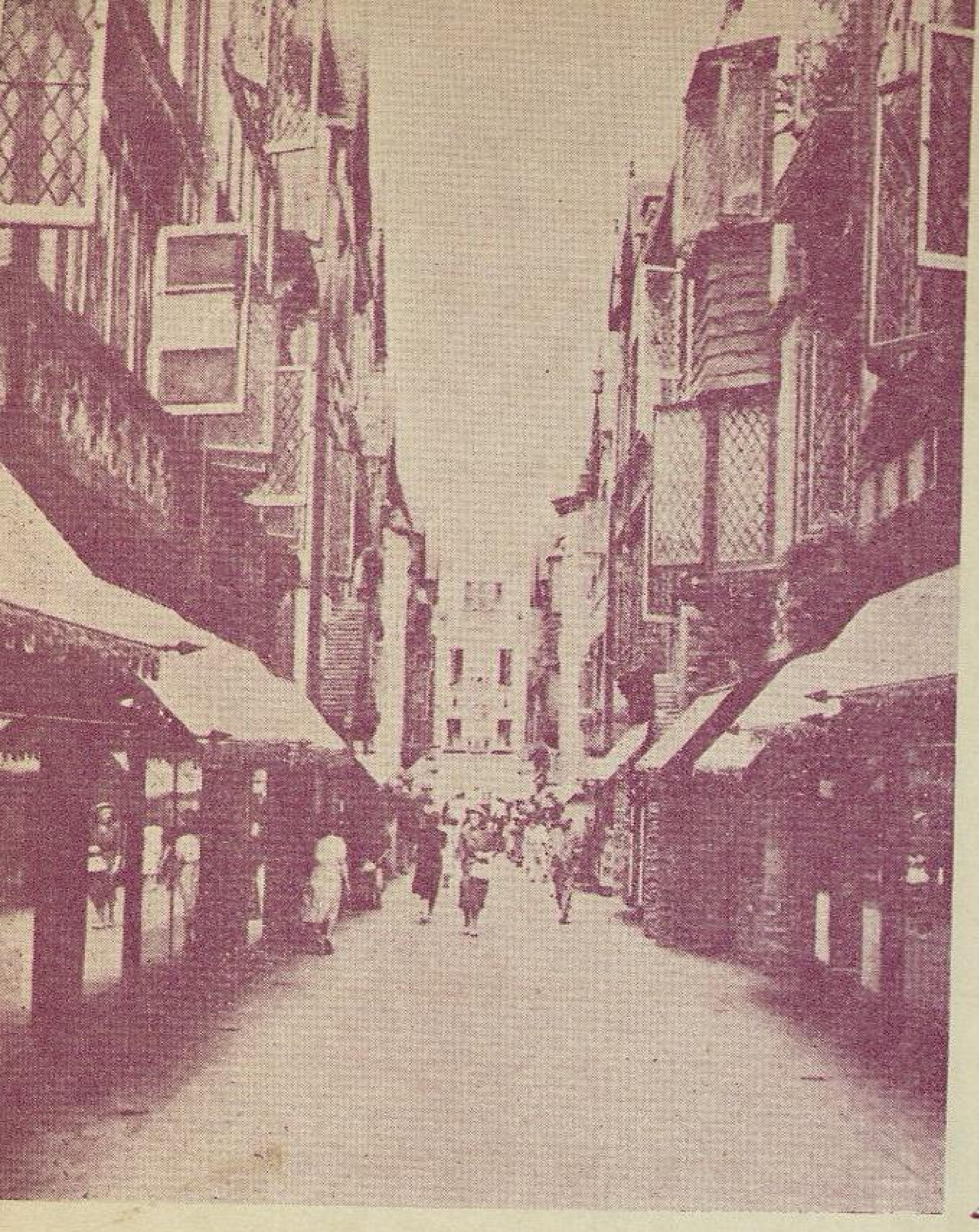
آسٹریلیا میں آبپاشی کے بیشتر منصوبے انیسویں صدی کے آخر میں تیار کیے گئے۔ جب آسٹریلیا کے چند دور اندیش سیاست دانوں نے کیلیفورنیا کے ایک نوجوان انجینیر چیفی کو دریائے مرے کا جائزہ لینے کے لیے یہاں بلایا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں آبپاشی کو بے حد ترقی دی گئی اور لاکھوں ایکڑ خشک زمین رس دار پھلوں کے جھومتے ہوئے باغات میں تبدیل ہو گئی۔ وہ علاقے جہاں آبپاشی کا زیادہ اچھا انتظام ہے، لیٹن (ساحل مرمبڈگی) اور دریائے مرے پر ایچیوکا سوان ہل اور ملڈورا کے مقامات ہیں۔ اب اس بڑے دریا کے پانی سے استفادہ کرنے کے لیے اس میں کئی جگہ بند تعمیر کیے گئے ہیں۔ آبپاشی کی ان تجویزوں کی بدولت اب یہاں اناج، السی، چاول، سبزیاں، خشک پھلوں، پھلوں کے ڈبوں اور دوسری اشیائے خورد و نوش کی پیداوار بہت زیادہ ہونے لگی ہے۔

نلوں کے ذریعے اندرونی خشک حصے میں پانی پہنچانے کا طریقہ پہلی بار آج سے ساٹھ برس پہلے آزمایا گیا۔ مغربی آسٹریلیا کے خشک ریگستان میں کال گورلی کے مقام پر پانی پہنچانے کے لیے مغربی آسٹریلیا کے ساحلی سلسلہ کوہ سے وہاں تک ساڑھے تین سو میل لمبا نل بچھایا گیا۔ اس جگہ سونے کی کانوں کے لیے پانی کی ضرورت تھی۔ حال ہی میں ایک اور ڈھائی سو میل لمبی پائپ لائن دریائے مرے سے سینٹ ون سینٹ کی خلیج پر واقع وی آلا کے صنعتی شہر تک بچھائی گئی ہے۔ یہاں جہاز سازی کے کارخانے ہیں۔ نلوں کے ذریعے سے پانی پہنچانے کا طریقہ، جنوبی آسٹریلیا میں بہت زیادہ رائج ہے۔ یہاں پانچ سو میل سے زیادہ لمبی پائپ لائنوں کے ذریعے سے اندرونی حصوں میں پانی پہنچایا جاتا ہے۔

دریاؤں اور ندیوں کی کمی کی وجہ سے آسٹریلیا میں برقابی طاقت کی زیادہ ترقی نہ ہو سکی۔ تاہم کئی ندیوں اور دریاؤں کے پانی کو اس غرض کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ یہاں کے بجلی گھر چار لاکھ اسّی ہزار اسپی طاقت کی بجلی مہیّا کرتے ہیں۔ تسمانیا میں جہاں بہت سے پہاڑی سلسلے واقع ہیں اور تیز بہنے والے دریا بکثرت موجود ہیں' پانی سے بجلی کی کافی طاقت حاصل کی جاتی ہے۔

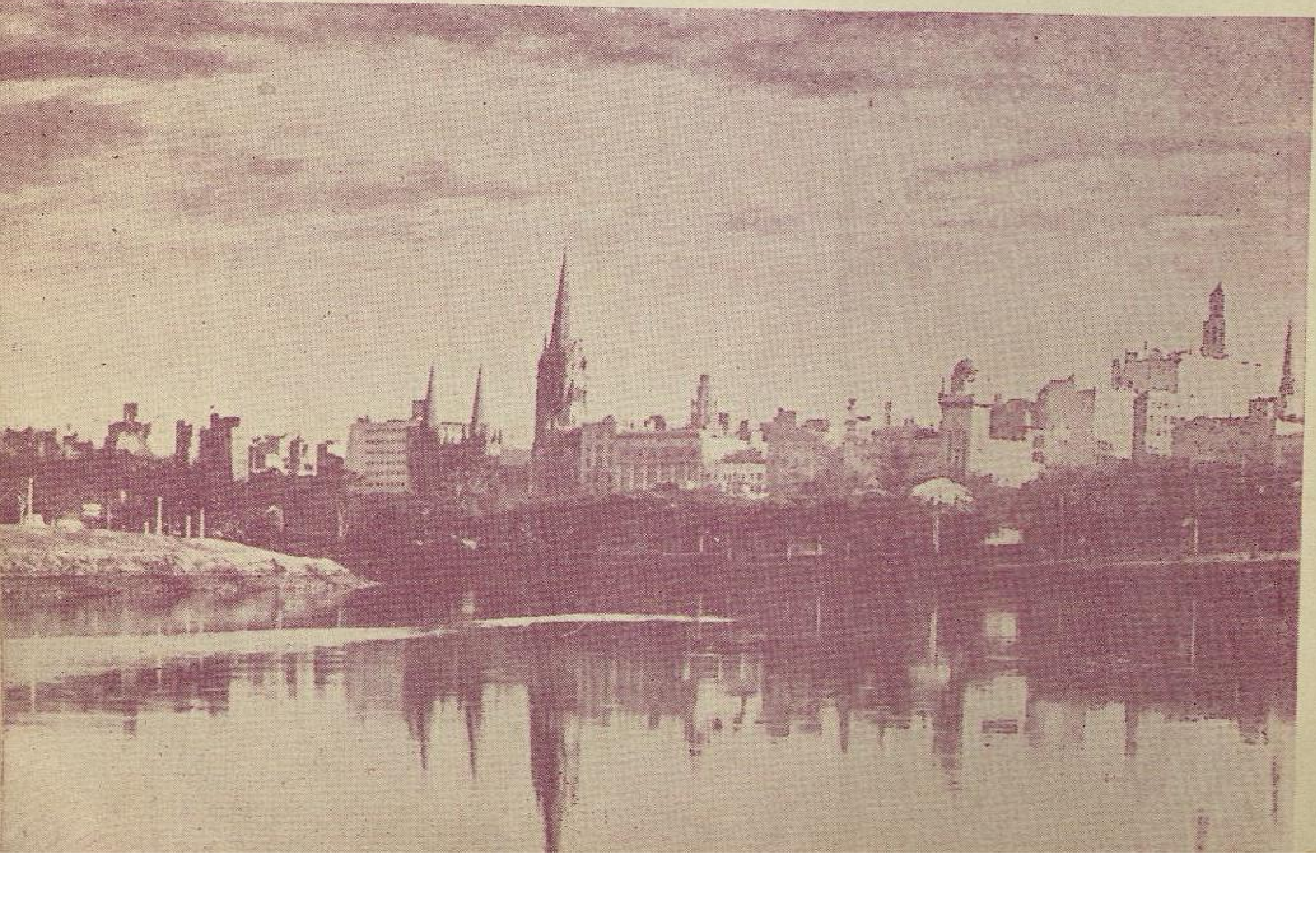
اس وقت سنوئی مونٹین ہائیڈرو الیکٹرک اتھارٹی کے زیر نگرانی آسٹریلوی ایلپس کی آبی طاقت کو استعمال کرنے کی تجویز پر عمل ہو رہا ہے۔ یہ پانی بعد میں آبپاشی کے لیے بھی استعمال ہو سکے گا۔ اس تجویز کا اصلی مقصد مشرق کی طرف بہنے والی ندیوں کے پانی سے استفادہ کرنا ہے۔ جن میں دریائے سنوئی اور دریائے ایوکمبین نسبتہً بڑے ہیں۔ ان کا پانی ایک سرنگ کے ذریعے سے مغرب کی طرف بہنے والے دریائے مرے اور مرمبڈگی میں ڈالا جائے گا۔ اس غرض کے لیے جو سرنگ اس وقت زیر تعمیر ہے وہ دنیا کی سب سے بڑی آبی سرنگ ہوگی۔ یہ سب پانی آبپاشی کے لیے استعمال ہوگا۔ راستے میں اس پانی سے بجلی بھی پیدا کی جائے گی۔ جس کے بعض بجلی گھر سطح زمین سے دو ہزار فٹ نیچے ہوں گے۔ اس تجویز کو مکمل کرنے کے لیے سات بند' سولہ بجلی گھر اور تقریباً نواسی میل لمبی سرنگیں بنائی جائیں گی۔ اس تجویز کے تحت ۱۹۸۰ء تک آسٹریلیا کی برقی طاقت تقریباً دگنی ہو جائے گی۔ اس کے بعد بہت سی ایسی تجویزوں سے جو ابھی زیر غور ہیں' آسٹریلیا کی صنعتی زندگی میں ایک بڑا انقلاب آجائے گا۔ سستی بجلی حاصل ہو سکے گی اور پہاڑوں کے مغربی ڈھلان کی زمینیں زرخیز ہو جائیں گی۔ آج جہاں صرف بھیڑیں اور مویشی پالے جاتے ہیں' وہاں نہایت عمدہ زراعتی فارم قائم ہو جائیں گے جس سے زرعی پیداوار میں بڑا اضافہ ہوگا۔

مذکورہ بالا طریقوں سے صرف پچاس سال کے عرصے میں آسٹریلیا کے لوگوں نے اس براعظم کے ریگستانوں کو زندگی بسر کرنے کے قابل بنا لیا ہے۔ اوّلین دریافت کرنے والے اس بات کا تصوّر بھی نہ کر سکتے تھے کہ ان ریگستانوں سے دولت حاصل ہو سکتی ہے۔

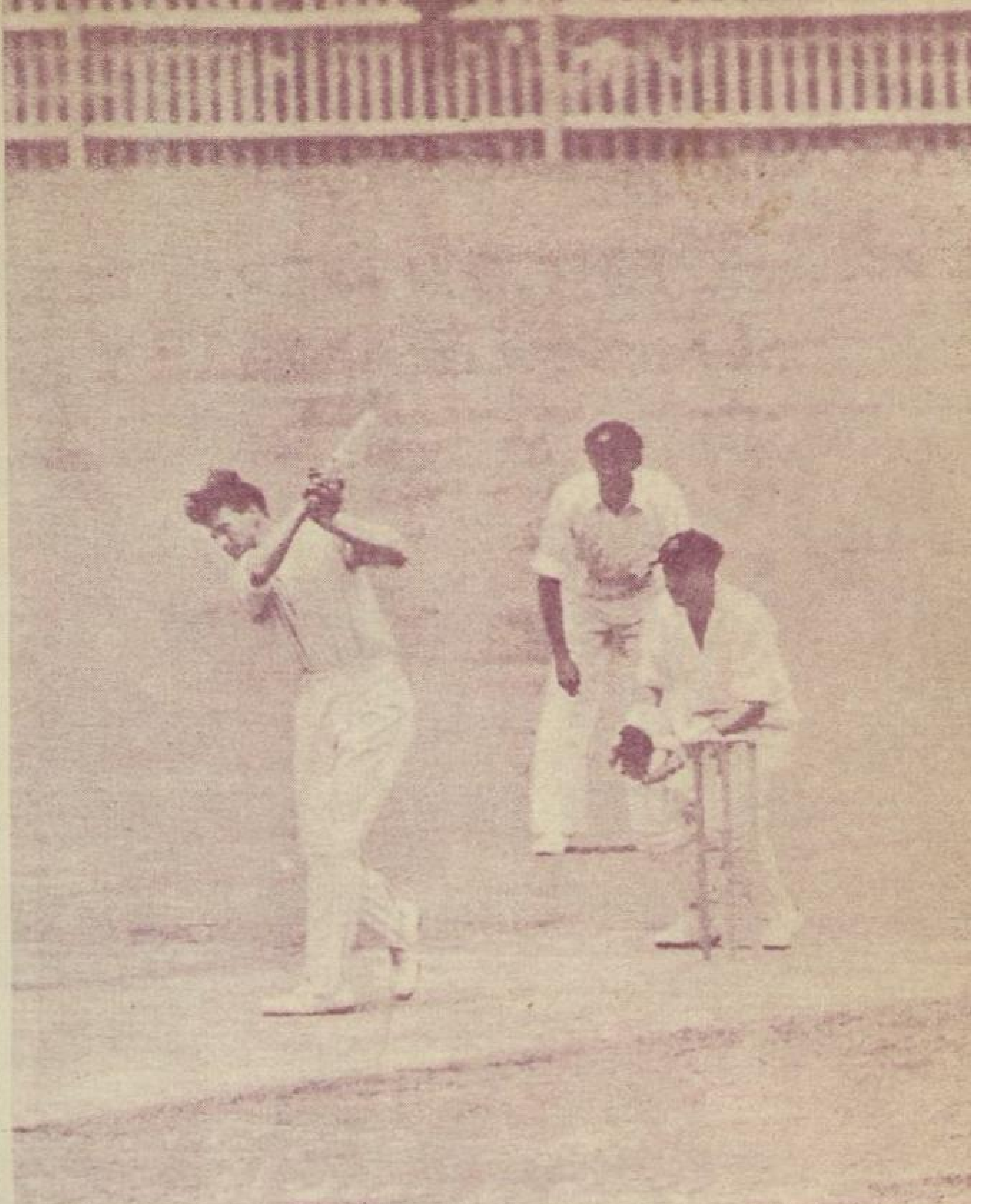


شہر پرتھ کا ایک بازار

صوبہ وکٹوریہ کا صدر مقام ملبورن جو دریائے یارا پر واقع ہے



کرکٹ کا ایک
مشہور کھلاڑی
کیتھ ملر
جو سڈنی کی
کرکٹ گراونڈ میں
کرکٹ
کھیل رہا ہے



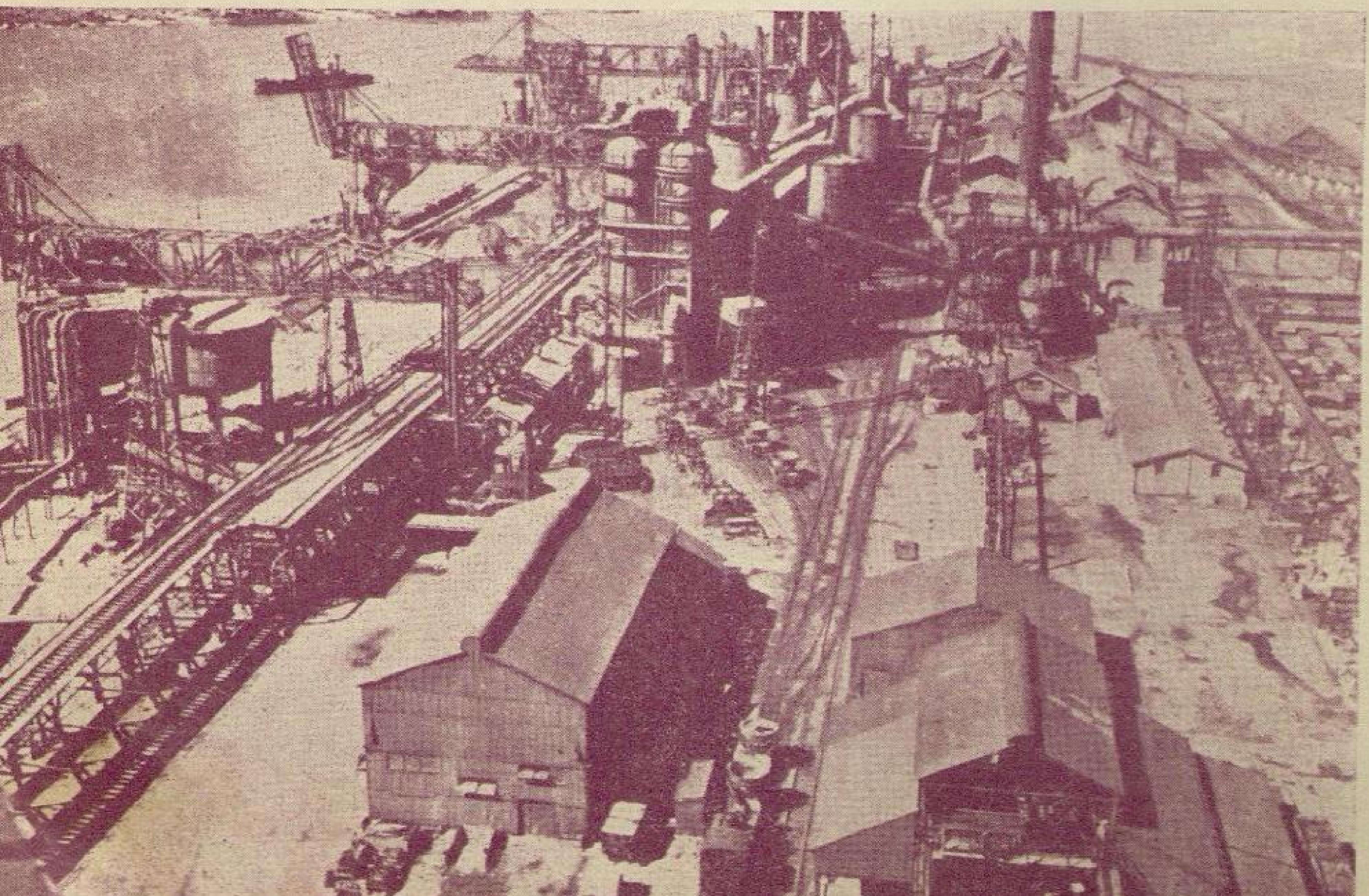
شہر سڈنی کے قریب ساحل بحر کا ایک منظر





شہر پرتھ
میں
مغربی آسٹریلیا
کی
یونیورسٹی کا
ایک کالج

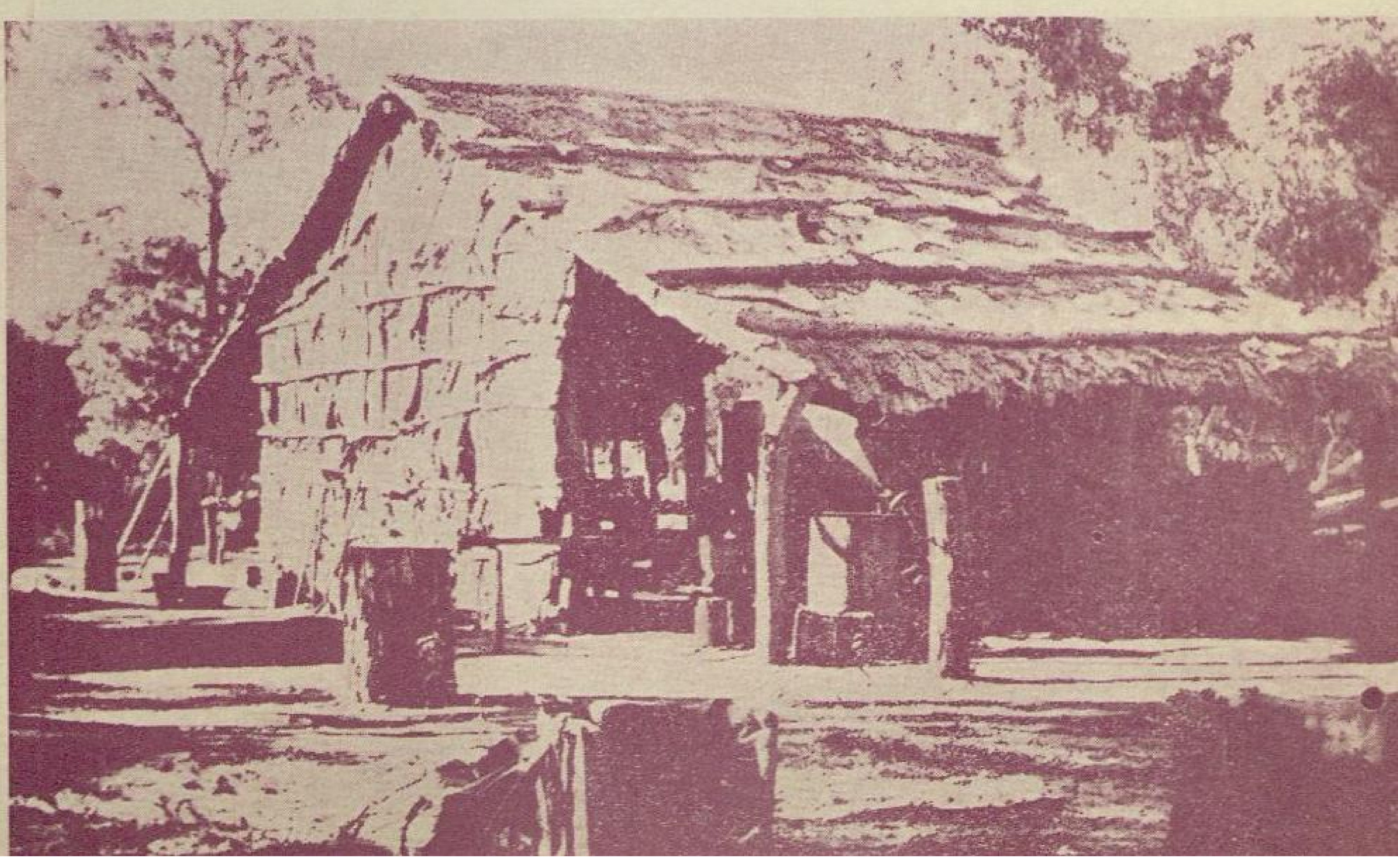
"بروکن ہل پروپرائٹری لمیٹڈ"
جو نیوکاسل میں آسٹریلیا کا سب سے بڑا صنعتی ادارہ ہے





شمالی
علاقے میں
مٹی کا
ایک تودہ
جسے
دیمک نے
بنایا

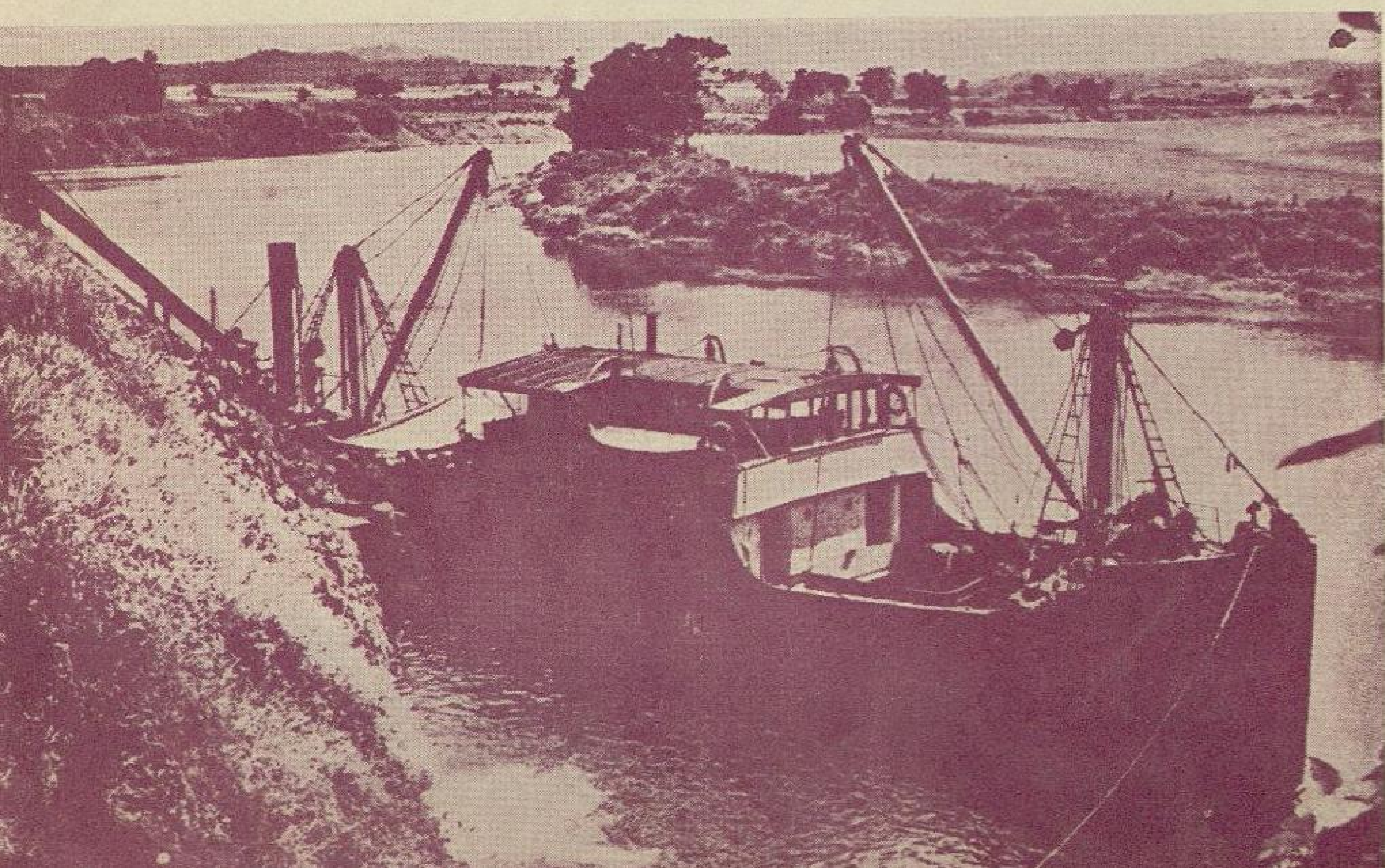
شمالی علاقے کا ایک گھر
جو لکڑی کے ستونوں اور درختوں کی چھال سے بنایا گیا ہے

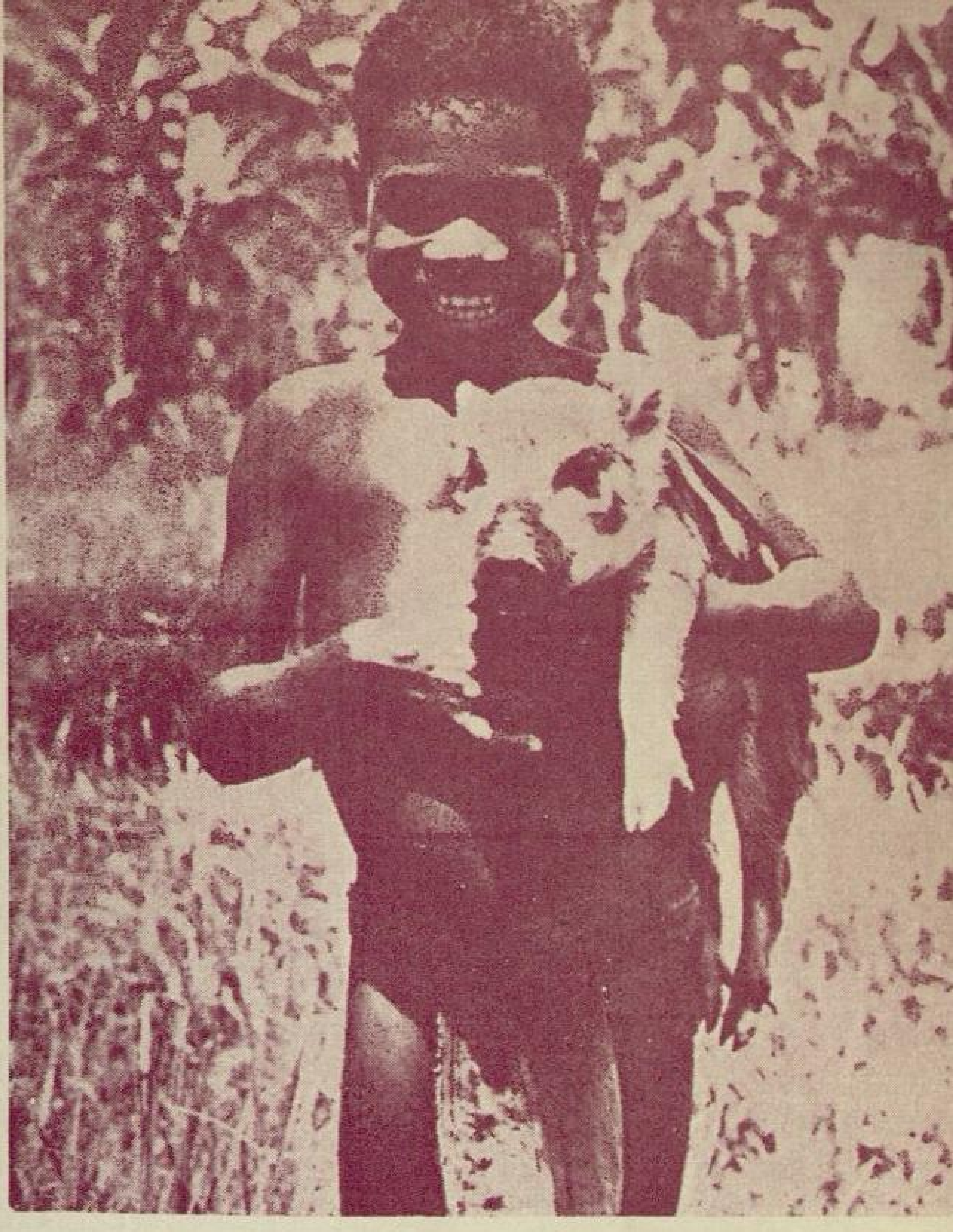




شمالی آسٹریلیا میں باربردار گدھے
جانوروں کے ایک کیمپ کے لیے سازوسامان لے جا رہے ہیں

صوبہ کوئین لینڈ میں دریائے جان سٹون میں
ایک جہاز میں گنے بار کیے جا رہے ہیں

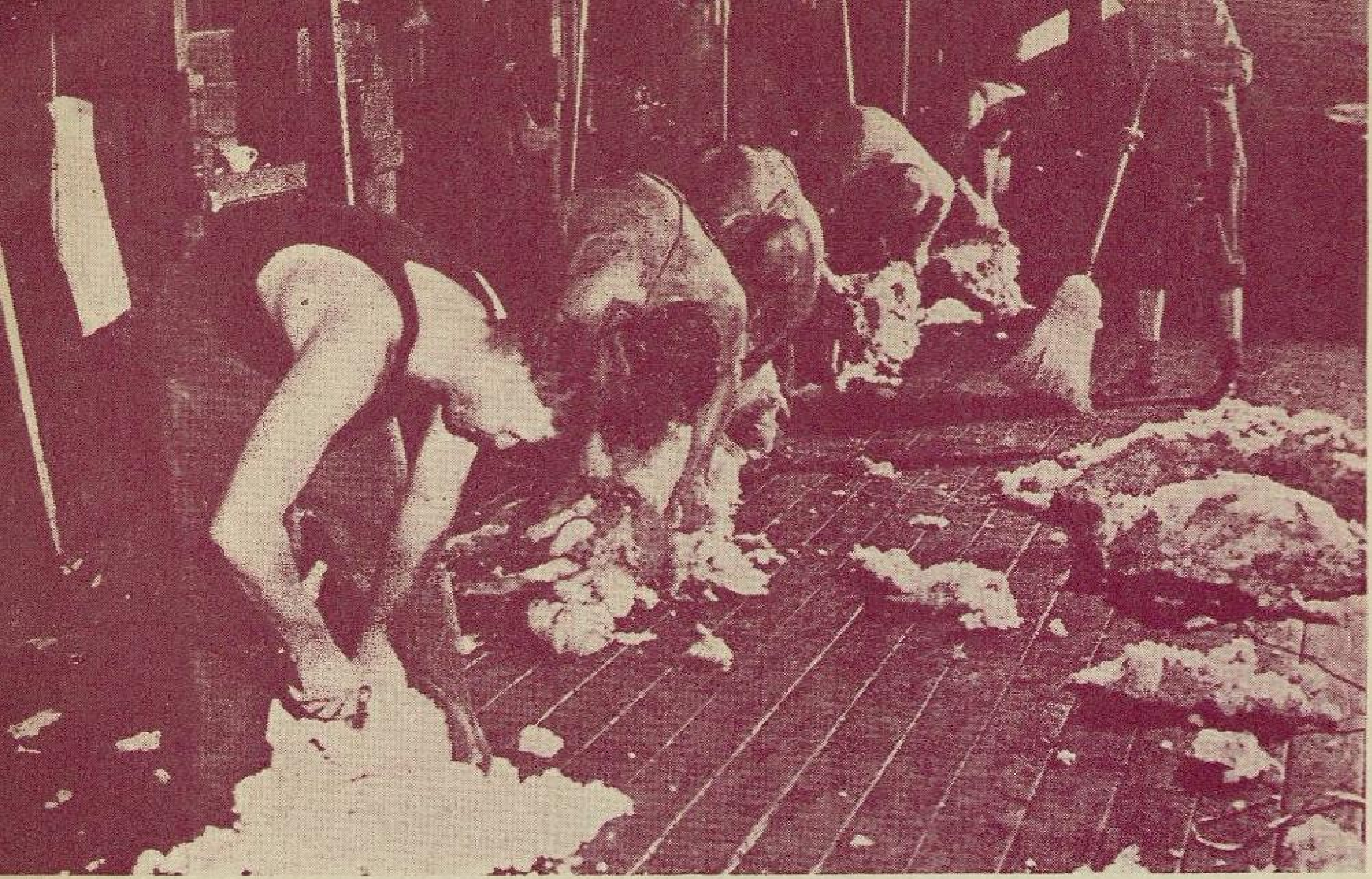




شمالی پاپوا کی اصل
قدیم قوم کا ایک لڑکا

اوبری کے مقام پر غاروں کے اندر دیواروں پر تصویریں پائی گئی ہیں

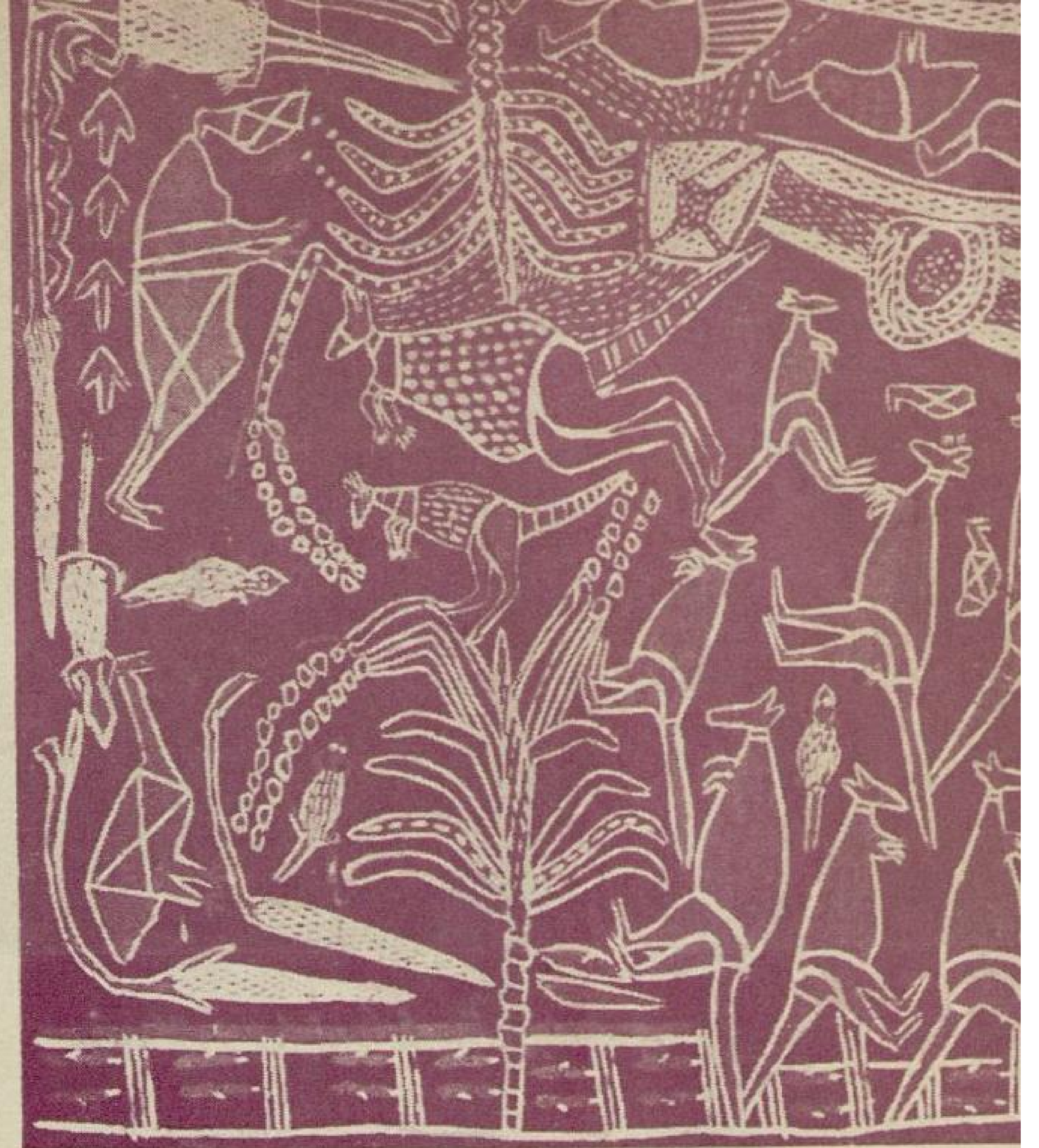




نیو ساؤتھ ویلز میں بھیڑوں کی اُون اتاری جا رہی ہے

سڈنی کی نمائش میں حصہ لینے کے لئے بھیڑیں بذریعہ ہوائی جہاز لائی گئی ہیں





درخت کی چھال پر
ملک کے اصلی باشندوں
نے ایک تصویر بنائی
ہے جس میں کنگرو اور
دوسرے جانوروں
کے شکار کا منظر
دکھایا گیا ہے

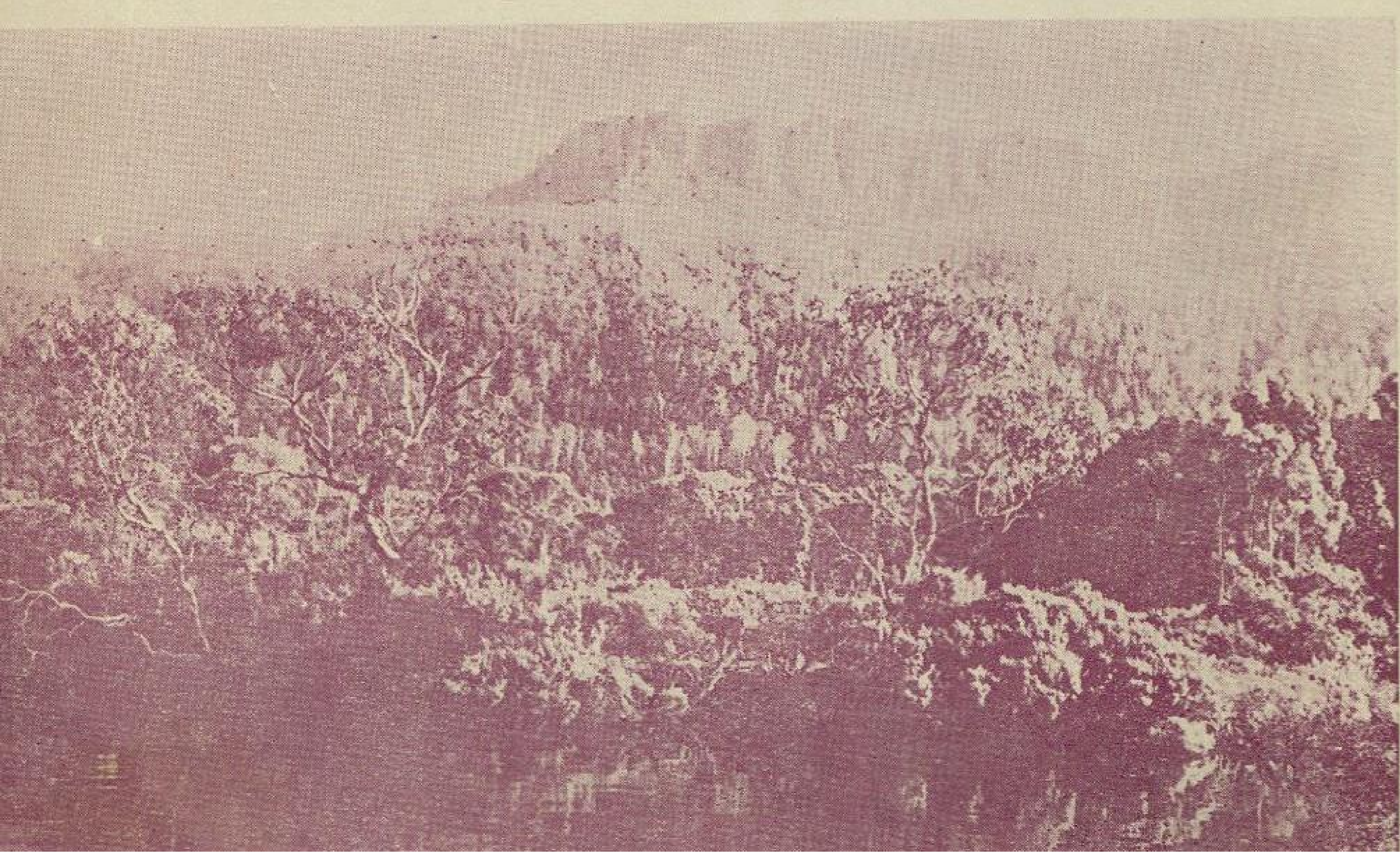
ریگستان کے کنارے پر بلالونا کے مقام پر جانوروں کا ایک فارم

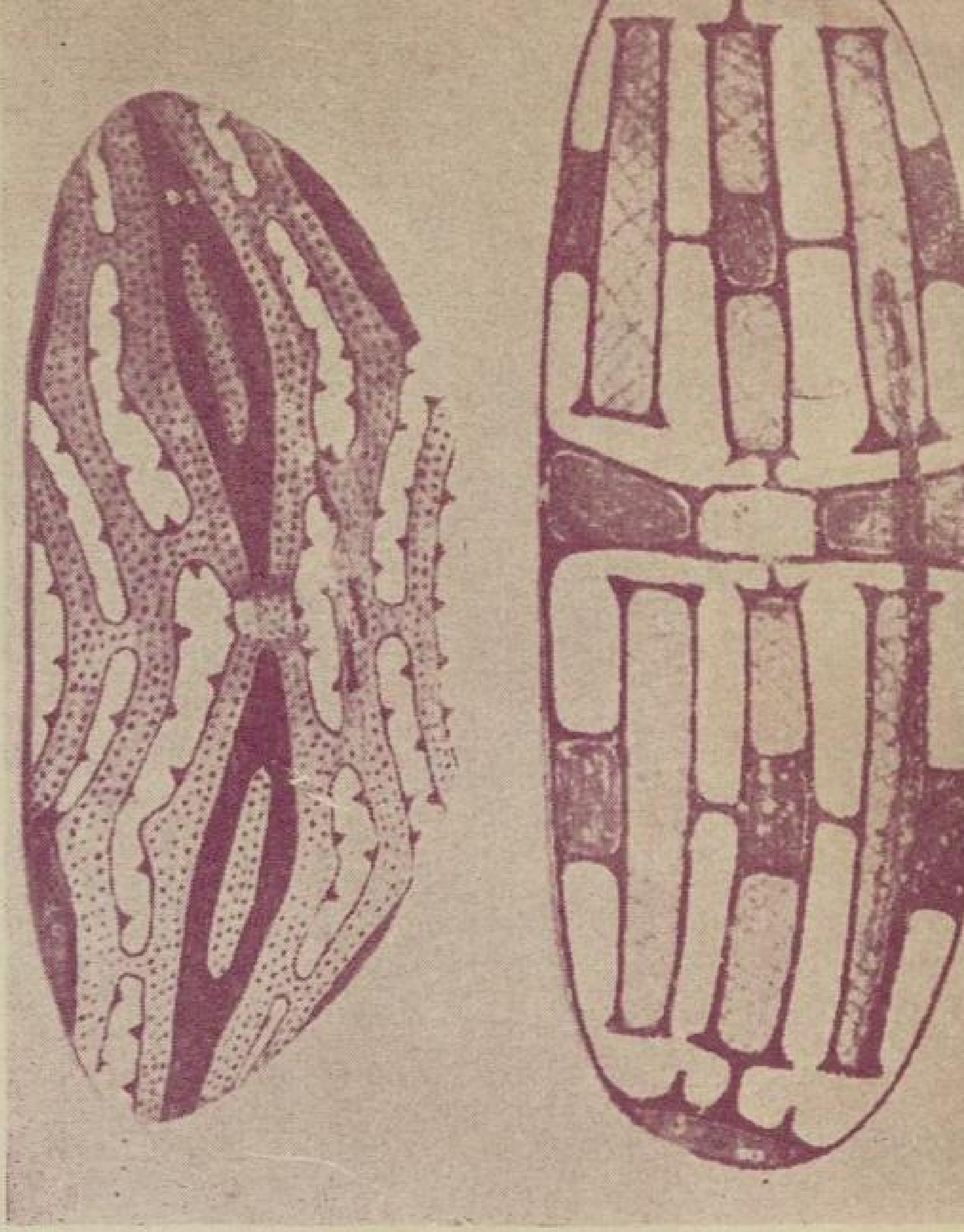




شہر ڈارون کا کنڈر گارٹن
اس قسم کی ابتدائی درسگاہیں تمام ملک بھر میں پائی جاتی ہیں

جزیرۂ تسمانیا کا کوہ المپس
جس کے دامن میں سینٹ کلیر کی جھیل دکھائی دیتی ہے





صوبہ کوئین لینڈ کے اصلی باشندوں
کی منقش ڈھالیں



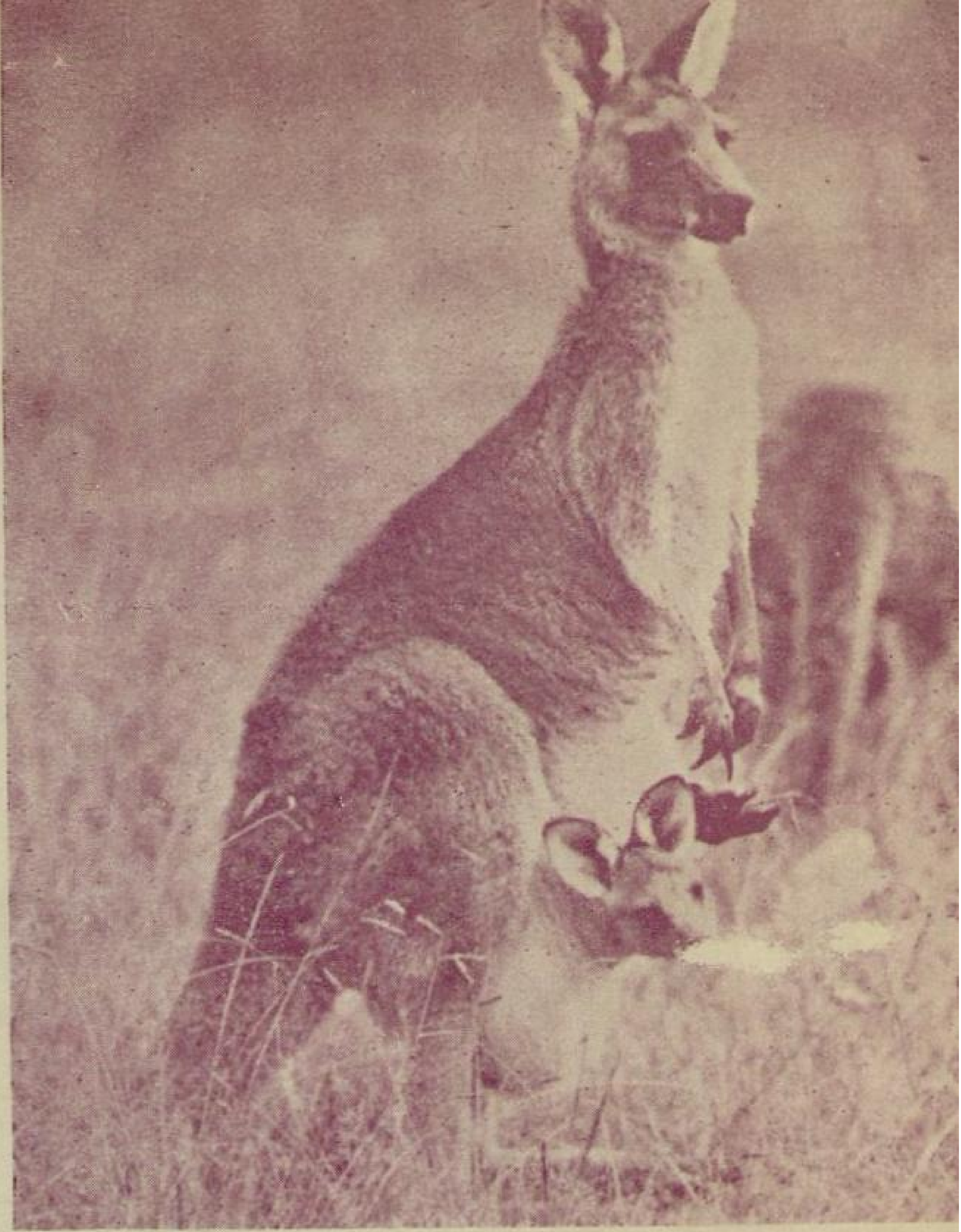
"بومرینگ" یعنی لکڑی کے خمیدہ ٹکڑے
جو پھینکنے والے کی طرف واپس آجاتے ہیں



ایک کوالا ریچھ

ایک قسم کا کنڈیالہ جو چیونٹیاں کھاتا ہے



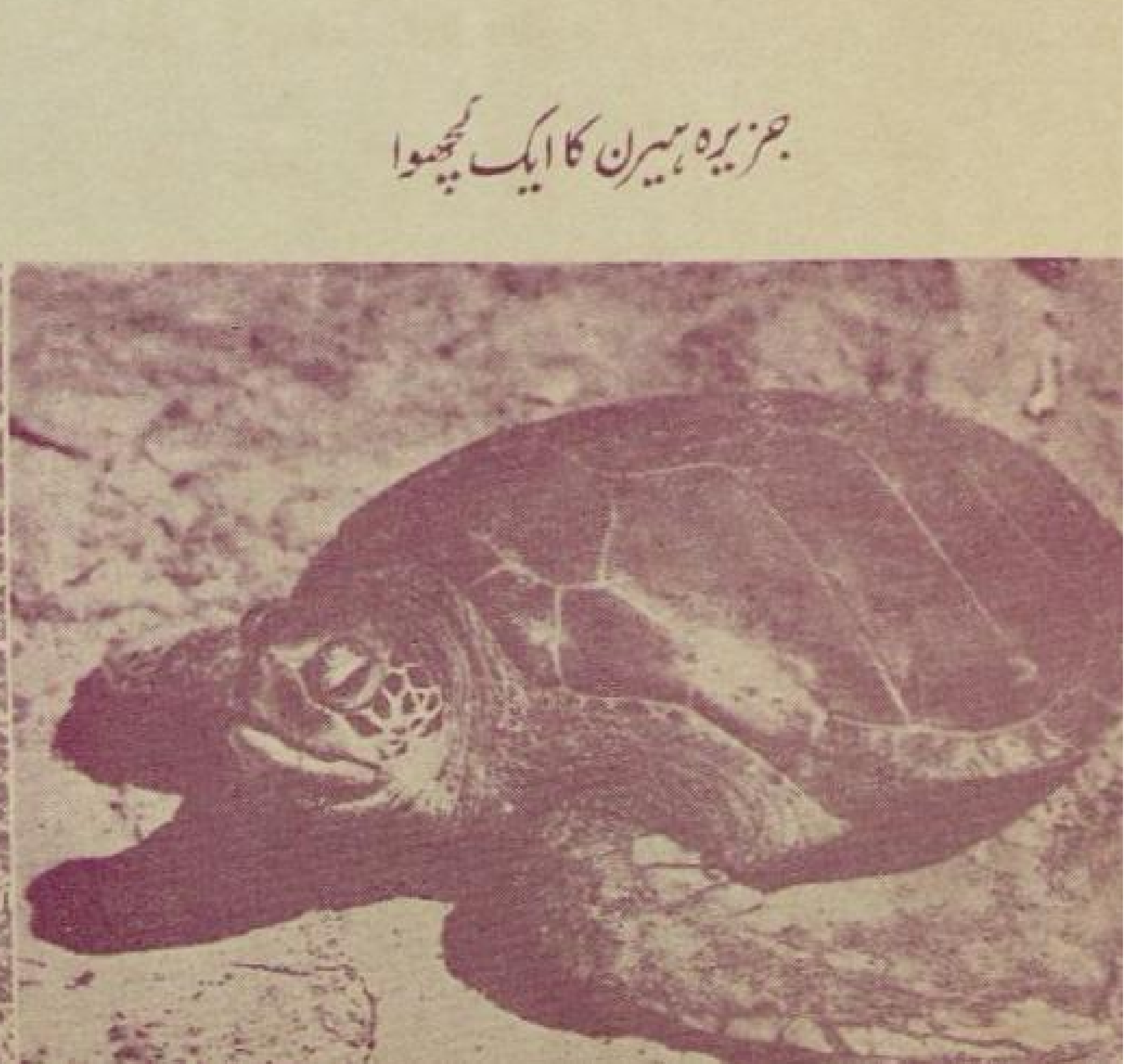


کینگرو اور اُس کا بچہ

”پلے ٹپس“



جزیرہ ہیرن کا ایک کچھوا



پندرھواں باب

سونا چاندی

ایک مہم جو انگریز نوجوان ایڈورڈ ہمنڈ ہارگریوز قسمت آزمائی کے لیے نیو ساؤتھ ویلز کی طرف نکل گیا، لیکن شروع میں اسے کامیابی نہ ہوئی۔ ۱۸۴۹ء میں اس نے ایک اخبار میں پڑھا کہ کیلیفورنیا میں سونا دریافت ہوا ہے۔ وہ فوراً ایک جہاز میں سوار ہو کر بحرالکاہل کے راستے سان فرانسسکو پہنچ گیا اور وُوڈز کریک کے میدان میں سونے کی کھدائی کرنے والوں میں شامل ہو گیا۔ یہاں اسے چنداں فائدہ حاصل نہ ہوا۔ لیکن اس نے فوراً ایک بات محسوس کی۔ اس نے دیکھا کہ کیلیفورنیا کا وہ علاقہ جہاں سے سونا حاصل ہوتا ہے، نیو ساؤتھ ویلز کے بعض حصوں سے بہت ملتا جلتا ہے، چنانچہ وہ ایک جہاز کے ذریعے سے دوبارہ سڈنی پہنچ گیا۔

یہاں ہارگریوز نے باتھرسٹ کے قریب کی اونچی نیچی وادیوں میں معدنی تفتیش شروع کر دی۔ ایک دن ایک خشک نالے کے ساتھ ساتھ جاتے ہوئے، وہ ایک ایسی جگہ پہنچا جہاں ایک چٹان کے نیچے کچھ پانی جمع تھا۔ یہاں ہارگریوز نے زمین کھود کر مٹی کے چھ طاسوں کو دھویا۔ ان میں سے چار میں اسے سونے کے کچھ ذرات ملے۔ پانچویں میں سونے کی چھوٹی سی ڈلی بھی ملی۔ یہ ۱۸۵۱ء کا واقعہ ہے۔ ہارگریوز نے، اس کے بعد اس جگہ کے ارد گرد کئی میل تک اور معدنی تفتیش کی اور واپس سڈنی چلا آیا۔ یہاں اس نے حکومت سے کہا کہ اگر اسے کچھ انعام دیا جائے تو وہ اُن کو وہ جگہ بتانے کے لیے تیار ہے جس جگہ اس نے سونا دریافت کیا ہے۔

ابھی یہ بات چیت ہو ہی رہی تھی کہ لوگوں کو اس کی خبر معلوم ہو گئی اور تین مہینوں کے اندر اندر چار سو سونا نکالنے والے ہارگریوز کریک کے پاس آ کر کیمپوں میں بیٹھ گئے۔ اس کے چھ ماہ بعد ایک دن آسٹریلیا کے ایک حبشی نے ایک کوارٹز پتھر کو چھڑی سے ابھار کر معلوم کیا کہ اس کا نصف سے زیادہ حصہ ٹھوس سونا ہے۔ یہ سونے کا ایک ایسا ڈھیلا تھا، جس کا وزن کئی پونڈ تھا۔ اس دریافت کی خبر بہت جلد تمام دنیا میں پھیل گئی اور سال کے آخر تک ہزاروں کان کن یہاں پہنچ گئے۔ بہت سے لوگ کیلیفورنیا سے بھی یہاں آئے۔ جگہ جگہ سونا حاصل ہونے لگا۔ ان دنوں دو ہزار اونس سونا ہر ہفتے سڈنی پہنچتا تھا۔

اس سے پہلے کئی موقعوں پر چرواہے اور تحقیق کرنے والے سونے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے سڈنی میں لائے تھے، لیکن اس نوآبادی کے حکمراں اس خبر کو دبا دیتے تھے۔ کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اس سے قیدیوں میں بے چینی پیدا ہو جائے گی لیکن جب ہارگریوز کیلیفورنیا سے مٹی کو دھو کر سونا نکالنے کا طریقہ سیکھ کر یہاں پہنچا تو اس کی دریافت سے یہاں سونا نکالنے والوں کا بڑا ہجوم ہو گیا۔ ہارگریوز کی دریافت کے بعد کچھ آبادکاروں نے پہلی دریافتوں کا خیال کرتے ہوئے بعض اور جگہوں پر بھی کھدائی کا کام شروع کر دیا۔ چند ماہ کے اندر چھ سات مقامات سے سونا برآمد ہونے لگا۔ ان میں سے ایک جگہ میلبورن کے قریب تھی، لیکن جب وکٹوریا کی ریاست میں بلارٹ اور بنڈی گو کے مقامات پر سونا ملا تو پہلی تمام دریافتیں اس کے سامنے ماند پڑ گئیں۔

بلارٹ میں ایک کھودنے والے نے جب زمین کے اندر چار فٹ گہرا گڑھا کھودا تو اس نے سونے کے ٹکڑے اس طرح زمین پر پھیلے دیکھے کہ وہ جگہ جوہری کی دکان معلوم ہوتی تھی۔ ایک اور شخص نے ایک جگہ سے ایک دن میں دس ہزار ڈالر کی مالیت کا سونا حاصل کیا۔ اسی طرح بنڈی گو کے ایک کان کن نے چھ ہفتے میں پندرہ ہزار ڈالر کا سونا حاصل کر لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا کے ہر حصے سے لاکھوں سونا حاصل کرنے والے بلارٹ اور بنڈی گو میں

پہنچ گئے۔ بلارٹ میں دریائے لی کے کنارے ایک جگہ آدھے میل کے اندر تین ہزار سونا کھودنے والوں نے مٹی دھونے کے تیرہ سو چھلنے لگا دیے۔ سونا حاصل کرنے کے متعلق اکثر ناقابلِ یقین کہانیاں بیان کی جاتی تھیں۔ مثلاً آٹھ حصے داروں کی ایک جماعت نے بلارٹ کے ایک قطعۂ زمین سے چونسٹھ ہزار ڈالر کا سونا حاصل کرنے کے بعد وہ قطعہ دس آدمیوں کی ایک اور جماعت کے ہاتھ بیچ دیا، جنھوں نے تین دن میں یہاں سے پچاس ہزار ڈالر کا سونا نکالا اور پھر ایک بارہ آدمیوں کی ایک اور جماعت کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ اس تیسری جماعت نے اسی قطعۂ زمین سے بہتر ہزار ڈالر کا سونا حاصل کیا۔ اس کے بعد پہلی دس آدمیوں کی جماعت نے اسی جگہ سے دوبارہ سونا نکالنا شروع کر دیا اور ایک ہفتے کے اندر پینتالیس ہزار ڈالر حاصل کرنے کے بعد پھر ایک اور جماعت کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ اس آخری جماعت نے بھی دو ہفتوں میں یہاں سے بیس ہزار ڈالر کی مالیت کا سونا حاصل کیا۔

جب ریاست وکٹوریا کا گورنر لاٹروپ سونے کی کانوں کو دیکھنے کے لیے آیا تو اس کے سامنے ایک صبح دو آدمیوں نے مٹی کے دو تسلوں میں سے آٹھ پونڈ سونا نکالا۔ ایک اور جماعت نے ایک کم گہرے گڑھے میں سے اکتیس پونڈ سونے کے ڈھیلے نکالے جو وہاں آلوؤں کی طرح ایک ہی جگہ پڑے تھے۔ ایک کان کن نے لاٹروپ کو ایک سونے کا ڈھیلا تحفے کے طور پر پیش کیا اور جب اس نے اتنا قیمتی ڈھیلا لینے سے انکار کیا تو اس کان کن نے کہا "جس جگہ سے میں یہ لایا ہوں وہاں بہت سے اور ایسے ڈھیلے موجود ہیں، آپ یہ ضرور قبول کر لیں۔" یہ بات بالکل ٹھیک تھی۔ بلارٹ کے قریب ایک تنگ گھاٹی میں چار ایسے بڑے بڑے سونے کے ڈھیلے نکلے جن میں سے ہر ایک کا وزن اسّی پونڈ سے زیادہ تھا اور ایک ڈھیلا جس کا نام سارا سینڈرز رکھا گیا، اس کا وزن ایک سو پینتیس پونڈ تھا۔

اس سے پہلے کسی جگہ سونے کی اتنی کانیں دریافت نہ ہوئی تھیں۔ امریکا میں کیلے فورنیا میں بھی اس قدر سونا حاصل نہ ہوا تھا۔ اس سلسلے میں زیادہ لوگوں کے آجانے سے بڑی

بد امنی پیدا ہو گئی - سونے کی کانوں پر اکثر لڑائیاں اور جھگڑے ہونے لگے - گھوڑے گاڑیوں کو راستے میں روک لیا جاتا اور سونا لے جانے والوں کو لوٹ لیا جاتا - چونکہ بہت سے لوگ قسمت آزمائی کے لیے ادھر آ گئے، اس لیے شروع میں اکثر شہر ویران ہو گئے، لیکن بعد میں تاجروں نے اور خوراک کا سامان بیچنے والوں نے بہت زیادہ فائدہ اٹھایا - میلبورن اور سڈنی کے شہر جو پہلے صرف چھوٹی بستیاں تھیں اب کاروبار کی وجہ سے بڑی بندرگاہیں بن گئیں اور یہاں ہزاروں جہاز آنے جانے لگے۔

ان دنوں جس قدر سونا آسٹریلیا میں نکالا گیا اس کی مالیت دس کھرب ڈالر کے قریب ہو گی - یہ روپیہ زیادہ تر لندن کے بنکوں میں جمع تھا اور آسٹریلیا کا ملک اس سے مشینیں، کارخانوں کا تیار کیا ہوا مال اور اپنی ضرورت کی تمام چیزیں خرید سکتا تھا - میلبورن اور سڈنی میں نو آبادی کی ٹکسالیں قائم کی گئیں جہاں سونے کے سکے بننے لگے - اس سے پہلے آسٹریلیا میں امریکی اور ہسپانوی ڈالر اور بعض اوقات ہندوستانی روپے استعمال ہوتے تھے - کبھی کبھی لین دین مبادلہ اجناس کی شکل میں ہوتا تھا - اب آسٹریلیا کا نظامِ زر مستقل ہو گیا لیکن اس دولت سے بھی زیادہ فائدہ آسٹریلیا کو ان لوگوں سے پہنچا جو اس برِ اعظم میں آ کر آباد ہو گئے تھے - جب ہارگریوز نے نئے علاقے دریافت کیے تو یہاں کی آبادی تین لاکھ سے بھی کم تھی۔ اس کے بعد اگلے بیس سال میں دس لاکھ سے زیادہ آدمی یہاں آ کر بس گئے - یہ نئی آبادی اس برِ اعظم کی سب سے بڑی دولت تھی - اب یہاں ہر قسم کا کام کرنے والے پہنچ چکے تھے۔ جن کے دلوں میں نیا جوش و خروش اور نئے خیالات موجود تھے - اس عرصے میں یہاں ایک بہت بڑا انقلاب آ چکا تھا - یہاں کی نرم مٹی میں جس قدر سونا موجود تھا، وہ جلد ہی ختم ہو گیا، لیکن کان کنوں کو اس سے مایوسی نہ ہوئی، ان میں سے کچھ "سونے کی سرزمین" کی تلاش میں صحراؤں میں آگے بڑھنے لگے۔

کوہ فاصلِ اعظم میں ایک جگہ جہاں سٹرٹ ایک بار مرتے مرتے بچا تھا، سونا تلاش

کرنے والوں نے چٹانوں میں بعض جگہوں پر کسی معدنی چیز کے نشان دیکھے جسے انھوں نے رانگا خیال کیا۔ یہاں سے کچی دھات کے کچھ ڈھیلے نمونے کے طور پر لندن بھیجے گئے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ یہ کونسی دھات ہے۔ اتفاق سے جس جہاز میں یہ دھات بھیجی گئی تھی، وہ طوفان میں پھنس گیا اور اسے ہلکا کرنے کے لیے دھات کے یہ ڈھیلے سمندر میں پھینک دیے گئے۔ ان معدنیات کی تلاش کرنے والوں میں سے ایک نے انتظار سے تنگ آکر اپنے حصے کو جوئے میں ہار دیا۔ چند سال میں اس کے اس ہارے ہوئے حصے کی قیمت ایک لاکھ پونڈ ہو گئی، جس دھات کے نشانات یہاں دیکھے گئے تھے، وہ رانگے کے بجائے چاندی ثابت ہوئی۔ یہ دریافت ۱۸۸۳ء میں ہوئی اور اس وقت سے لے کر اس وقت تک یہاں بروکن ہل کی کانوں سے ایک کھرب ڈالر کی مالیت کی چاندی، سیسا اور جست نکالا جا چکا ہے۔

اس کے بعد کوئینز لینڈ کے علاقے میں سونے کی کچھ اور بڑی کانیں دریافت ہوئیں۔ یہاں تین بھائیوں نے ایک شخص سے وہ ٹیلا جس کا نام اب کوہ مارگن ہے، پانچ ڈالر فی ایکڑ کے حساب سے خریدا۔ یہ تینوں بھائی مارگن برادران کے نام سے مشہور ہیں۔ بیچنے والے کو کیا معلوم تھا کہ اس کے نیچے کون سی دھات چھپی ہوئی ہے۔ مونٹ مارگن کی اس کان سے پچیس سال کے اندر سات کروڑ ڈالر کی یافت ہوئی۔ لیکن آسٹریلیا کی سب سے بڑی معدنی دریافت مغربی آسٹریلیا میں ہوئی۔ یہاں اس جگہ کے شمال میں جہاں آئر اپنی مہم کے دوران پہنچا تھا، معدنیات کی تلاش کرنے والے دو اشخاص بیلی اور فورڈ نے ۱۸۹۲ء میں اتوار کی سہ پہر کو ایک چٹان دریافت کی جس میں سے اُن کو پانچ سو اونس سونا ملا۔ اب سونا کھودنے والے اس طرف کو بھاگے اور مشہور "سنہری میل" دریافت ہو گیا۔ اس جگہ عین صحرا میں کال گورلی اور کول گارڈی کے شہر آباد ہو گئے اور یہاں کی کانوں سے جو دنیا کی سب سے بڑی کانوں میں شمار ہوتی ہیں اس وقت تک دو کھرب ڈالر کی مالیت کا سونا حاصل ہو چکا ہے اور اب تک نکل رہا ہے۔

دوسری قیمتی معدنیات بھی دریافت ہوئیں۔ ایک گڈریے نے جس کا نام پکٹ تھا، ایڈی لیڈ کے سَو میل شمال میں ایک کان دریافت کی جہاں سے پندرہ کروڑ ڈالر کا تانبا حاصل ہوا۔ تسمانیا اور نیو ساؤتھ ویلز میں رانگے کی کانیں بھی ملیں۔ ان کے علاوہ میگنیشیم، ٹنگ سٹن، کوبالٹ، چلیسم، اور فلورائسٹ وغیرہ اور کئی اور معدنیات بھی دریافت کی گئیں۔

جواہرات بھی بعض جگہ پائے گئے۔ کچھ ہیرے بھی ملے۔ ان کے علاوہ نیلم اور یاقوت بکثرت پائے جاتے ہیں۔ زمرّد، پکھراج، سنگِ زرد، کئی اور اقسام کے یاقوت، پیلے زمرّد، سنگِ سلیمانی، سنگِ یَشب، ان کے علاوہ مزید ایک درجن خوبصورت قیمتی پتھر یہاں سے حاصل ہوئے ہیں۔ ایک اور نایاب پتھر آسٹریلوی سیاہ پتھر[1] (اوپل) بھی اس جگہ ملتا ہے۔ جو دنیا میں اور کہیں نہیں پایا جاتا۔ اگر اسے عمدہ طریقے سے تراشا جائے تو اس میں ایک پُر اسرار خوبصورتی پائی جاتی ہے اور اس میں سے شعلے کے مانند سرخ رنگ، سبز، نیلے اور سرخ رنگوں کی جھلک نظر آتی ہے۔ یہ قیمتی پتھر، شمالی ریگستانوں کی وسعتوں میں پایا جاتا ہے۔ اسے کوئی بڑی صنعت شمار نہیں کیا جاتا اور صرف اِکّے دُکّے کان کن اس علاقے میں اس کی تلاش میں جاتے ہیں۔ جو تن تنہا کسی ایک کان کن کو مل جاتا ہے پانچ ہزار ڈالر تک قیمت پاتا ہے۔

دوسری جنگِ عظیم کے فوراً بعد یہاں ایک اور دریافت ہوئی۔ یہ یورینیم کی دریافت تھی۔ اس سے پہلے بھی بروکن ہل کے قریب ریڈیم ہل کے مقام پر ریڈیو کار دھاتیں پائی گئی تھیں، لیکن ایٹمی طاقت کی ترقی کے بعد سیکڑوں معدنیات دریافت کرنے والے، اپنے آلات کے ساتھ اور ریڈیو کار دھاتوں کو ڈھونڈنے کے لیے یہاں پہنچے۔ ریڈیم کی دریافت کا غلغلہ تو کئی جگہ اٹھا لیکن ڈاروِن سے تقریباً اسّی میل جنوب میں اس جگہ جسے رَم کے جنگل کہتے

---

[1] ایک طرح کا بلّور جس کے مختلف رنگ ہوتے ہیں۔ عام طور پر سفید رنگ ہوتا ہے۔ کالا رنگ آسٹریلیا کے سوا اور کہیں نہیں ہوتا۔

ہیں یہ دھات یقینی طور پر موجود ہے۔ اس کا تجزیہ کرنے سے یہاں دریافت ہونے والی دھات کافی قیمتی ثابت ہوئی ہے اور اس کے خریدنے کے لیے آسٹریلیا کی حکومت اور ریاستہائے متحدہ کی ایٹمی طاقت کے کمیشن کے درمیان ایک سمجھوتا ہو چکا ہے۔ آسٹریلیا کے لوگوں کو اس بات کی امید ہے کہ ان کے وسیع برِاعظم میں یہ قیمتی دھات کئی اور جگہ اس سے بھی زیادہ مقدار میں موجود ہوگی۔

"ناقابلِ انکشاف سرزمین" کے تھوڑے سے راز معلوم ہو گئے ہیں، لیکن بہت سے ہنوز چھپے ہوئے ہیں۔

سولھواں باب

اوّلین باشندے

آسٹریلیا میں قیدیوں کے بھیجنے کا سلسلہ تقریباً ساٹھ سال تک جاری رہا۔ شروع میں ان کے ساتھ کافی نرمی کا برتاؤ ہوتا تھا' لیکن بعد میں بہت سختی برتی جانے لگی۔ "ضابطۂ قیدیاں" کی خلاف ورزی کرنے والوں کو نہایت سخت سزائیں دی جانے لگیں۔ مردوں کو بیڑیاں پہنائی جاتی تھیں اور کوڑے لگانے کی سزا عام تھی۔ انیسویں صدی کے شروع میں بنی نوع انسان سے ہمدردی رکھنے والے کچھ انگریزوں نے اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ اس پر دارالعوام کی ایک کمیٹی نے لوگوں کی شہادتیں حاصل کیں' جن سے یہ ثابت ہوا کہ یہ طریقہ جس پر ہر سال حکومت کے پانچ لاکھ پونڈ صرف ہوتے تھے' بالکل بے کار تھا' کیونکہ اس سے نہ تو جرائم میں کمی ہوئی اور نہ ملک کی بیکاری دور ہو سکی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۴۰ء میں اس نظام کو ختم کر دیا گیا۔ اس وقت تک پچھتر ہزار قیدی نیو ساؤتھ ویلز میں اور ستائیس ہزار تسمانیا میں بھیجے جا چکے تھے۔ ان میں ہزاروں' جو اپنی قید کی میعاد ختم کر چکے تھے' آزاد کر دیے گئے اور آئندہ چند سال میں بہت سے اور قیدیوں کو مچلکوں پر رہا کر دیا گیا۔

آسٹریلیا میں بھیجے جانے والے قیدیوں میں بہت سے سیاسی قیدی بھی شامل تھے۔ ان میں سکاٹ لینڈ کے فدائیوں کی ایک جماعت بھی تھی۔ یہ سرکش اور ضدی لوگ انگلستانی پارلیمنٹ کی اصلاح کے طالب تھے۔ انھی میں ٹولپڈل فدائیوں کی جماعت تھی۔ یہ لوگ ڈورسیٹ شائر کے مزدور تھے جو مزدوروں کی انجمن بنانے کے خواہاں تھے۔ انھی میں ہزاروں

آئرلینڈ کے باغی بھی تھے، جنھوں نے آئرلینڈ میں برطانیہ کے جابرانہ قوانین کا مقابلہ کیا تھا۔

آسٹریلیا کو بھیجے جانے والے قیدیوں میں، سب سے زیادہ بااثر لوگ چارٹسٹ تھے۔ یہ انگلستان میں نچلے درمیانی درجے کے لوگوں کی ایک تحریک کے رکن تھے جو برطانیہ کی حکومت سے چھ بنیادی اصولوں کا مطالبہ کرتے تھے۔ جن باتوں کا ان کی طرف سے مطالبہ کیا گیا تھا، وہ آج نہایت معقول معلوم ہوتی ہیں۔ وہ چاہتے تھے کہ انتخاب پرچیوں کے ذریعے سے ہو۔ ہر ایک کو اپنا ووٹ دینے کی پوری آزادی ہو، پارلیمنٹ کے ارکان کو تنخواہیں دی جائیں وغیرہ وغیرہ۔ اُس وقت اُن کے اس مطالبے کو بنیادی اصولوں کے خلاف سمجھا جاتا تھا، اور اس وجہ سے بہت سے چارٹسٹ لوگ آسٹریلیا میں بھیج دیے گئے تھے۔

اس طرح یہ تحریک دبنے کے بجائے ایک اور نئی سرزمین میں پہنچ گئی۔ چارٹسٹ لوگوں کو آسٹریلیا میں ایک جماعت کی شکل میں کام کرنے کا موقع تو نہ مل سکا، لیکن ان کے خیالات سارے ملک میں پھیل گئے اور انھی کی وجہ سے آسٹریلیا کی آزادی کے لیے نعرے بلند ہونے لگے۔ اس ملک کے آزاد لوگوں اور مویشی پالنے والوں کو ان نعروں کی اصلیت کا علم نہ تھا، لیکن وہ اپنے ملک کے لیے آزادی حاصل کرنے کے جوش میں بے سمجھے بوجھے، اس تحریک میں شامل ہو گئے۔ مویشی پالنے والے اور رہا شدہ قیدی آزادی خواہ جماعت میں شامل ہو گئے۔ چنانچہ ۱۸۵۰ء میں برطانیہ نے نیو ساؤتھ ویلز، ساؤتھ آسٹریلیا اور وکٹوریا کی ریاستوں کو نوآبادی کا درجہ عطا کر کے حکومت خود اختیاری دے دی۔ مکمل آزادی ابھی تک نہ ملی تھی اور ووٹ دینے کے لیے یہ ضروری تھا کہ رائے دہندہ کسی قدر جائداد کا مالک ہو یا مقررہ آمدنی رکھتا ہو۔ ان پابندیوں کے ماسوا ان بستیوں کو تمام مالی معاملات میں ہر قسم کی آزادی تھی اور وہ اپنی مرضی کے مطابق کسٹم اور ٹیکس لگا سکتے تھے۔

سونے کی کانیں دریافت ہونے پر، جب اور بہت سے لوگ آسٹریلیا پہنچ گئے تو وہ اپنے ساتھ نئے خیالات بھی لے کر آئے۔ اس زمانے میں برِّ اعظم یورپ میں بڑی تبدیلیاں ہو رہی تھیں، چنانچہ بہت سے انقلابی اور جمہوری خیالات جنھوں نے یورپ کو متزلزل کر دیا تھا، یہاں بھی پہنچ گئے۔ مثلاً لوگوں کے لیے یہ تصوّر ناقابلِ برداشت ہو گیا کہ آسٹریلیا میں جس قدر سونا پایا جاتا ہے، اسے شاہِ برطانیہ کی ملکیت سمجھا جائے۔ اگرچہ یہ ایک ایسا دعویٰ تھا کہ اس کے متعلق زبردستی کوئی قانون جاری نہیں کیا جا سکتا تھا، لیکن اسی اصول کی بنا پر حکومت کھودنے والوں سے سات ڈالر ماہوار بطور فیس لے لیتی تھی۔ سونا نکالنے والوں کو چاہے سونا ملے یا نہ ملے، لیکن انھیں یہ رقم ادا کرنی پڑتی تھی۔ اس کے خلاف احتجاج کیا گیا، فسادات بھی ہوئے لیکن گولڈ فیلڈز پولیس ان لوگوں پر جرمانے کرتی رہی اور لائسنس کے بغیر کام کرنے والے کان کنوں کو جیل میں ڈالتی رہی۔

کان کنوں نے یہ محسوس کیا کہ ہر موقع پر ان سے ناجائز طور پر رقم لی جاتی ہے۔ کان کنوں کے قریب کچھ شراب کی بدنام بھٹیاں بھی قائم ہو گئی تھیں۔ ایک روز اسی قسم کی ایک بھٹی میں جس کا شاندار نام "یوریکا ہوٹل" تھا ایک کان کن جھگڑے میں مارا گیا۔ اس کے ساتھیوں نے اس ہوٹل کو جلا دیا۔ اس واقعے کے بعد تقریباً دس ہزار کان کنوں کا اجتماع ہوا، جس میں سخت نفرت اور غصّے کا اظہار کیا گیا اور حکومت کے جاری کردہ لائسنسوں کو اکٹھا کر کے آگ کی نذر کر دیا گیا۔ اس کے بعد سونا نکالنے والے کان کنوں نے بلارٹ ریفارم لیگ کے نام سے ایک انجمن قائم کی۔ اس کے چُنے ہوئے ممبروں کی ایک کمیٹی بنا دی گئی، جس میں آئرلینڈ، انگلستان، ویلز، جرمنی اور اٹلی کے باشندے شامل تھے۔ اس کمیٹی نے کان کنوں کی شکایات کی اصلی وجہ معلوم کرنے کے بعد اصلاح کے لیے ایک سیاسی پروگرام بنایا جو اس زمانے کے مطابق انتہا پسندانہ سمجھا جا سکتا تھا۔

وکٹوریا کے نئے گورنر نے بغاوت کے اندیشے سے فوج کا ایک دستہ منگوا لیا، لیکن کان کن سپاہیوں پر جھپٹ پڑے۔ ان کے ہتھیار اور گولہ بارود چھین لیا اور کچھ تباہ کر دیا۔ فوج کے سپاہیوں نے تلواریں کھینچ کر ہجوم پر حملہ کر دیا۔ ٹرینٹی کالج کے ایک آئرستانی پیٹر لالور نے کان کنوں کی کمان سنبھال لی اور تقریباً ایک ایکڑ جگہ میں جسے یوریکا لینڈ کہتے تھے کچھ کان کنوں نے لکڑی کے گٹھوں اور پتھروں سے مورچہ بنا لیا اور ایک ایسے کان کن کی زیرِ نگرانی جو روسی فوج میں رہ چکا تھا، قواعد کرنے لگے۔ لالور اور ریفارم کمیٹی نے وکٹوریا کی جمہوری حکومت کا اعلان کیا اور ایک نیلا جھنڈا بلند کر دیا، جس پر جنوبی صلیب کے سفید ستاروں کے نشان بنے ہوئے تھے۔ جس قدر کان کن جمع تھے، سب نے اس بات کی قسم کھائی کہ وہ اپنے حقوق اور آزادی کے لیے ایک دوسرے کے دوش بہ دوش لڑیں گے۔ کان کنوں کے پاس تقریباً بیس رائفلیں تھیں۔ آئرلینڈ کے کچھ باشندوں نے اپنے آپ کو نیزوں سے بھی مسلح کر لیا جنھیں جرمنی کے ایک لوہار نے تیار کیا تھا۔ کیلی فورنیا کے کان کنوں کی ایک الگ فوج تھی، جن کے پاس چھ گولیوں والے کولٹ ریوالور بھی تھے۔

اتوار کی صبح کو چار بجے سپاہیوں اور پولیس نے حملہ کر دیا۔ یہ ۱۸۵۴ء کا واقعہ ہے۔ یہ حملہ بالکل اچانک کیا گیا، لیکن اس کی اطلاع فوراً ہو گئی، اور جو گولیاں مورچوں سے چلائی گئیں ان سے فوج کا کمانڈنگ آفیسر اور کچھ سپاہی مارے گئے۔ سپاہیوں نے بھی جواب میں گولیاں چلائیں اور سنگینوں کے ساتھ حملہ کیا۔ بیس منٹ تک خوب جنگ ہوئی۔ ستاروں والا نیلا جھنڈا زمین پر گرا دیا گیا۔ لالور کے بازو پر گولی لگی اور وہ بیہوش ہو کر گر پڑا۔ بیس کے قریب کان کن جن میں سے آدھے آئرلینڈ کے باشندے تھے اور چار سپاہی تھے، مارے گئے اور بہت سے زخمی ہوئے۔

یوریکا کا مورچہ آسٹریلیا کی تاریخ میں ایک معمولی واقعہ تھا، لیکن کئی وجوہ سے اس کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ یہ برطانیہ کے دفترِ نوآبادیات کی قدامت پسندانہ اور جابر حکومت

کے خلاف آزاد نو آبادکاروں کی ناراضی کا زبردست مظاہرہ تھا۔ یہ جمہوری حکومت کی جدوجہد میں ایک نہایت نازک موقع تھا۔ بعد میں پیٹر لالور پر نکتہ چینی کرنے والوں نے اس پر الزام بھی لگایا۔ لالور نے جواب دیا۔ "میں ان صاحبان سے یہی پوچھتا ہوں کہ جمہوریت سے ان کی کیا مراد ہے؟ کیا وہ اسے چارٹزم، اشتراکیت یا عوامی حکومت سمجھتے ہیں؟ اگر ایسا ہے تو نہ میرے خیالات اس قسم کے پہلے تھے اور نہ اس وقت ہیں اور نہ آئندہ ہوں گے۔ لیکن اگر جمہوری حکومت کا یہ مطلب ہے کہ حکومت کے جبارہ اجارہ داروں اور ظالم حاکموں کی مخالفت کی جائے تو میں پہلے بھی ایسے خیالات کا حامل تھا اور اب بھی اس بات کا حامی ہوں اور ہمیشہ جمہوریت پسند رہوں گا۔" لالور کے اس بیان سے آسٹریلیا کی سیاسی ترقی کے لیے راستہ کھل گیا۔ وہ لوگ نہ چارٹسٹ تھے نہ کمیونسٹ اور نہ ریپبلکن تھے بلکہ صرف جمہوریت پسند تھے جو ہر مخالف عنصر سے الجھنے کو تیار تھے۔

دفتر نو آبادیات نے بڑی بے بسی سے کان کنوں پر لائسنس کی پابندی کو ختم کر دیا۔ یوریکا کی بغاوت کے سربراہوں کو معاف کر دیا گیا اور اس کے بعد آسٹریلیا کے لوگوں کی آزادی کی طرف ایک نرم پالیسی اختیار کر لی گئی۔ پیٹر لالور جس کا ایک بازو کٹ چکا تھا نو آبادی وکٹوریہ کی پارلیمنٹ کا نہایت قابلِ تعظیم رکن سمجھا جاتا تھا۔ بدقسمتی سے وہ اس وقت تک زندہ نہ رہ سکا جب آسٹریلیا میں ایک آزاد وفاقی حکومت قائم ہوئی اور ستاروں والا نیلا جھنڈا بلند کیا گیا جس کے ایک کونے میں یونین جیک تھا۔

یوریکا کی شہرت سارے ملک میں پھیل گئی اور کئی سال تک لوگ "یوریکا کے کان کن" کہلانے کو باعثِ فخر سمجھتے رہے۔ آخرکار جب سونا ختم ہو گیا تو کان کن کا لفظ صرف عزت کے لیے استعمال ہونے لگا۔ اس کے ساٹھ سال بعد پہلی جنگِ عظیم کے دوران میں یہاں کے سپاہی اکثر ایک دوسرے کو کان کن (ڈگر) کے لفظ سے مخاطب کیا کرتے تھے۔ اگرچہ اس لفظ کے اس طرح استعمال ہونے کی وجہ کسی کو معلوم نہیں۔

انیسویں صدی کے نصف آخر میں آسٹریلیا کی مکمل آزادی کے لیے، بہت تیزی، لیکن احتیاط سے کام ہوا۔ برطانیہ اور امریکا دونوں ملکوں سے پہلے، آسٹریلیا نے ووٹوں کے لیے بیلٹ کا طریقہ اختیار کیا اور عورتوں کو بھی ووٹ دینے کا حق مل گیا۔ بہت سی ریاستوں نے ملک کے اندرونی حصوں تک ریلوے لائنیں تعمیر کرائیں اور طاقت کے ذرائع نیز دوسری عوامی ضروریات پر رقمیں صرف کیں۔ ذاتی کاروبار میں کوئی رکاوٹ نہ رہی اور اس طرح مختلف کاموں میں نفع کے لیے سرمایہ لگانے کے واسطے بہت سی دولت آسٹریلیا میں پہنچنے لگی۔ ملک کی بہتری کے کاموں کی طرف بھی توجہ کی گئی۔ اگرچہ بعض نو آبادیوں میں کچھ پرائیویٹ اسکول موجود تھے، لیکن تعلیم عام کا خیال بھی شروع ہی سے عوام کے دلوں میں موجود تھا۔ سنہ ۱۸۶۰ء میں نو آبادی کی بہت سی حکومتوں نے قوانین تعلیم نافذ کر دیے۔ اور سارے ملک میں پبلک اسکول قائم ہو گئے۔ اس کے بعد ثانوی سکول قائم ہوئے اور دارالحکومتوں میں یونیورسٹیاں بھی قائم ہوگئیں اس وقت حکومت کی زیر نگرانی آسٹریلیا کا مفت اور آزاد تعلیمی نظام اس وقت بڑی تقویت کا باعث ہے۔

انیسویں صدی کے نصف آخر میں آسٹریلیا کے باشندے بڑی سختی سے جمہوریت پسندانہ خیالات پر قائم رہے اور اس باب میں انھوں نے اپنی کوشش جاری رکھی۔ اگرچہ کچھ عرصے کے لیے مسلسل قحط سالیوں کے باعث یہ لوگ کچھ مایوس ہو گئے تھے لیکن وہ لگاتار اپنے وسیع ملک کو بہتر بنانے میں مصروف ہیں۔

سترھواں باب

دیومالا اور اساطیر

انیسویں صدی کا نصف آخر وہ زمانہ تھا جب آسٹریلیا کے لوگوں نے اپنی پرانی روایات کو قائم کیا اور اپنے ملک کے متعلق کہانیاں اور پرانی داستانیں لکھیں۔ ان کا یہ ادب مغربی امریکا کی اس قسم کی کہانیوں سے بہت ملتا جلتا ہے۔ ایسی کہانیوں میں زیادہ تر گھوڑے گاڑیوں کا راستے میں پکڑے جانا، گھوڑوں کے لمبے سفر اور پستول رکھنے والے ڈاکوؤں کا ذکر ہے۔ آسٹریلیا میں ایسے لوگوں کو "بُش رینجرز" کہتے تھے۔ قیدیوں کی درآمد کے زمانے میں یہ لوگ بھاگے ہوئے بدمعاش ہوتے تھے جو اکثر جھاڑیوں والے علاقے میں چھپ کر مسافروں اور قریب کی فارموں کو لوٹا کرتے تھے۔ ان میں ایک ایسا بھی تھا جس نے از راہِ فخر اپنا نام "راہزن" اور "شاہِ قزاقاں" رکھا تھا۔ بعض بدنام ڈاکو بھی ان میں شامل تھے۔ جو پکڑے جاتے تھے تو ان کو فوراً سزائے موت دے دی جاتی تھی۔ ان میں سے کچھ بھاگ کر سان فرانسسکو پہنچ گئے تھے جہاں انھیں "سڈنی کووز" اور ڈروونٹ ڈکس کہا جاتا تھا۔ ان میں سے ایک سڈنی کوو جس کا نام جان جینکنز تھا، اس بات کے لیے مشہور ہے کہ وہ پہلا شخص تھا جسے سان فرانسسکو کی پولیس نے پکڑ کر پھانسی کی سزا دلوائی۔

سونا دریافت ہونے کے بعد، جب یہاں بہت سے اور لوگ پہنچ گئے تو ان جھاڑیوں کے ڈاکوؤں کو نئے شکار ملنے لگے۔ ایک نوجوان دلیر امریکی فری مین کوب نے جو یہاں سونا دریافت کرنے کے لیے آیا تھا، اپنے ملک سے بہت سی گھوڑا گاڑیاں خریدیں اور ان میں تھوڑی سی تبدیلیوں کے بعد ان کو اس بغیر سڑکوں کے جھاڑیوں والے علاقے میں تیزی سے چلنے کے قابل بنایا۔ چنانچہ جلدی ہی کوب کی امریکی گاڑیاں جنوبی آسٹریلیا کے مختلف

حصّوں میں ڈاک لے جانے لگیں۔ انھی گاڑیوں کے ذریعے سے باتھرسٹ سے سڈنی اور بلارٹ سے میلبورن سونا پہنچایا جاتا تھا۔ ان گاڑیوں کی حفاظت کے لیے چھوٹی چھوٹی بندوقوں سے مسلح کچھ سپاہی بھی ہوتے تھے۔ کوب کی یہ گاڑیاں اکثر راستے میں روک لی جاتی تھیں جن کے متعلق بہت سی عجیب و غریب کہانیاں مشہور ہیں۔

جھاڑیوں میں رہنے والے ڈاکو نئے آنے والے لوگوں کی نسبت اس علاقے کو بہت اچھی طرح جانتے تھے۔ وہ اکثر مرکزوں سے گھوڑے چُرا لے جاتے۔ انھیں پہاڑوں کے اندر ایسی چھپنے کی جگہیں معلوم تھیں، جہاں کوئی ان کا پیچھا نہ کر سکتا تھا۔ انھی میں سے کچھ بڑے خونخوار ڈاکو تھے۔ میتھیو بریڈی اس زمانے کا ایک مشہور ڈاکو تھا جس کے ہاتھوں بہت سے لوگ مارے گئے۔ آخرکار ایک دور دراز راستے پر فوجی سپاہیوں سے اس کا مقابلہ ہوا جس میں وہ مارا گیا۔ ان ڈاکوؤں میں سے بعض میں کچھ خوبیاں بھی تھیں۔ مثلاً ڈاڑھی والا بن ہال اور کپتان تھنڈر بولٹ (برق) اپنی خوش اخلاقی کے لیے مشہور تھے۔ یہ عورتوں کو نہیں لوٹتے تھے اور بعض اوقات لوگوں کے ذاتی جواہرات واپس کر دیتے تھے۔ تھنڈر بولٹ کا اصلی نام فرانک گارڈینر تھا۔ جب آخرکار وہ پکڑا گیا اور سڈنی جیل میں قید کر دیا گیا تو عوام کی خواہش کے مطابق اس کو قول لے کر رہا کر دیا گیا، جس کے بعد وہ سان فرانسسکو چلا گیا اور وہاں اس نے ایک ہوٹل کھول لیا۔

آسٹریلیا کے جھاڑیوں کے علاقے کے ڈاکو، سونے کی تلاش میں آنے والے لوگوں کے بعد نمودار ہوئے۔ نیڈ کیلی بہت سی باتوں میں امریکا کے مشہور ڈاکو بلی دی کڈ سے ملتا ہے اور اس کے متعلق بہت سے قصّے اور کہانیاں لکھے گئے ہیں، لیکن اصل واقعہ کچھ اس طرح ہے کہ ایک قیدی جون کیلی تسمانیا میں اپنی قید کی میعاد ختم کر کے ۱۸۵۰ء کے بعد ریاست وکٹوریا میں آ گیا۔ اسے فارم کھولنے کے لیے جو زمین دی گئی، اس سے زیادہ پیداوار نہ ہو سکی۔ اور اس نے اس ریاست کے مرکزوں سے گھوڑے چرانے شروع کر دیے۔ ریاست وکٹوریا میں

اس وقت بھی بہت سا پہاڑوں اور وادیوں کا علاقہ نامعلوم پڑا تھا۔ وہ اسی راستے سے ان گھوڑوں کو نیو ساؤتھ ویلز میں بیچنے کے لیے لے جاتا۔ ایک دفعہ گھوڑے چوری کرنے والے ایک اور مخالف گروہ نے کیلی اور اس کے کنبے کو گرفتار کر لیا اور انھیں پکڑ کر اس ویران علاقے میں لے گئے جسے کوہستان کہتے ہیں۔ ان کو یہاں چھوڑنے کے بعد یہ دھمکی دی گئی کہ اگر وہ دہاں سے واپس آئے تو مار ڈالے جائیں گے۔ چند سال بعد کیلی سات بچّے چھوڑ کر مر گیا۔

کیلی کے نوجوان بیٹے بڑے ہوشیار ڈاکو بن گئے۔ ابھی وہ کم عمر ہی تھے کہ انھوں نے اپنے باپ کا پیشہ اختیار کر لیا اور اکثر اس راستے سے گزرنے والوں کو لوٹنے لگے۔ چند سال بعد اُن نوجوانوں کی گرفتاری کے وارنٹ جاری ہو گئے۔ ان کے نام تھے نیڈ، جم اور ڈان۔ کیلی کے صرف یہی تین بیٹے تھے۔ باقی لڑکیاں تھیں۔ جب جم ڈاکہ ڈالنے کے جرم میں دس سال کی سزا کاٹ رہا تھا تو نیڈ اور ڈان چند اور جوانوں، سٹیوہارٹ اور جو برن کے ساتھ مل گئے۔ ڈان نے ایک سپاہی کو، جس نے اسے گرفتار کرنے کی کوشش کی، زخمی کر دیا اور جنگل میں فرار ہو گیا۔ چند ماہ بعد جب فوج کا ایک دستہ ان کا کھوج لگانے کے بعد انھیں گرفتار کرنے کے لیے آیا تو وہ ایک جگہ چھپ کر بیٹھ گئے اور تین سپاہیوں کو گولیوں سے مار ڈالا۔ حکومت نے ان کو پکڑنے کے لیے انعام مقرر کیا۔ یہ نوجوان ڈاکو چند چھوٹے شہروں میں پہنچے اور وہاں کے بنکوں کو لوٹنے کے بعد پھر جنگل میں جا چھپے۔ دو سال تک پھر انھیں گرفتار نہ کیا جا سکا۔ آخرکار ان کا ایک ساتھی آرون شیرٹ جسے دس ہزار ڈالر انعام دینے کا وعدہ کیا گیا تھا، لالچ دے کر انھیں اپنے گھر لے آیا۔ جب نیڈ اور ڈان کو معلوم ہوا کہ وہ انھیں دھوکے سے گرفتار کرانا چاہتا ہے تو انھوں نے اسے اس کے دروازے ہی پہ گولی سے اڑا دیا۔ اب ساری بستی کیلی کے جتھے کے خلاف ہو گئی۔ سیکڑوں پولیس کے سپاہیوں اور مسلّح

آباد کاروں نے انھیں گھیرے میں لے لیا۔ مایوسی کی حالت میں انھوں نے ایک آخری مقابلہ کرنے کی کوشش کی اور گھوڑے دوڑاتے ہوئے گلن رون کے شہر میں پہنچے اور وہاں کے تمام لوگوں کو ایک ہوٹل میں بند کر دیا۔ اس کے بعد شہر سے آنے والی ریلوے لائن کو اکھاڑ دیا۔ اگلے روز میلبورن سے پولیس کے بہت سے سپاہی وہاں پہنچ گئے اور انھوں نے ہوٹل کا محاصرہ کر لیا۔ کیلی کے بیٹوں نے اپنے قیدیوں کو رہا کر دیا اور فوج پر گولی چلانے لگے۔

جس وقت یہ جنگ جاری تھی پولیس کے سپاہیوں کے پیچھے ایک عجیب شخص نمودار ہوا۔ یہ نیڈ کیلی تھا جو رات کو چپکے سے پولیس کی صفوں میں سے گزر کر نکل گیا تھا۔ وہ ایک زرہ بکتر پہنے ہوئے تھا، جسے اس نے ہلوں کے لوہے کے پتروں سے ایک لوہار سے خاص طور پر تیار کروایا تھا۔ نیڈ نے دائیں بائیں گولیاں چلانی شروع کیں لیکن فوراً ہی یہ معلوم کر لیا گیا کہ اس کی ٹانگیں زرہ بکتر سے ڈھکی ہوئی نہ تھیں۔ پولیس نے نیچے کی طرف گولیاں چلائیں اور اس طرح سے اسے مغلوب کر لیا گیا۔ جب پولیس آگے پہنچی تو انھوں نے دیکھا کہ ڈان کیلی، سٹیو ہارٹ اور جو برن اپنی رائفلوں سے خودکشی کر چکے تھے۔ نیڈ کو پھانسی دینے کے لیے میلبورن لے جایا گیا اور اس طرح سے اس زمانے کے آخری ڈاکو کا خاتمہ ہو گیا۔

انھی واقعات سے آسٹریلیا کی پرانی کہانیاں لکھی گئیں۔ کیلی کے اس گروہ کا بہت سے ڈراموں اور کہانیوں میں ذکر آتا ہے اور اس کی ایک فلم بھی تیار کی گئی ہے۔ میلبورن کے پولیس ہیڈ کوارٹرز میں نیڈ کا زرہ بکتر آج تک موجود ہے۔ جو جرائم کے عجائب خانے میں نمائش کی ایک عمدہ چیز تصور ہوتا ہے۔

اٹھارھواں باب

طرزِ حکومت

انیسویں صدی میں آسٹریلیا چھ جداگانہ برطانوی نو آبادیوں کا مجموعہ تھا۔ اگرچہ ان میں سے ہر ایک نو آبادی کی اپنی حکومت تھی، لیکن یہ سب برطانیہ کے دفتر نو آبادیات کے تحت تھیں۔ اس وقت تک سارے ملک کی مرکزی حکومت نہ تھی۔

۱۸۵۰ء میں برطانیہ کے دفترِ نو آبادیات نے سب بستیوں کے نمائندوں کی اسمبلی بنانے کی کوشش کی۔ لیکن اس وقت اس تجویز پر عمل نہ ہو سکا[1]۔ ایک گورنر جنرل مقرر کیا گیا جس کے فرائض میں صرف جہاز رانی، روشنی کے میناروں، ماہی گیری، ڈاک اور ناپ تول کے پیمانوں کی نگرانی کا کام شامل تھا لیکن سونے کی دریافت سے ملک میں جو جوش و خروش پیدا ہوا اس کی وجہ سے نو آبادیوں کی حکومت کو ایک مرکز کے تحت لانے کا کام رُک گیا اور کئی سال تک یہاں کی ریاستوں کے درمیان کسٹم کی پابندیاں قائم رہیں۔

۱۸۸۰ء کے بعد فیڈرل کونسل کے لیے ایک تحریک شروع ہوئی لیکن اس کی عام حمایت نہ ہوئی۔ آخرکار آسٹریلیا کے لوگوں نے اس بات کو محسوس کیا کہ فرانس اور جرمنی کی حکومتیں بحرالکاہل کے بہت سے جزیروں پر اپنا قبضہ جمانے کی کوشش کر رہی ہیں اور آسٹریلیا کے پاس انھیں روکنے کے لیے کوئی قومی فوج نہیں ہے۔ اس مقصد کے لیے مرکزی حکومت کی ضرورت کا احساس ہوا۔

---

[1] ۱۸۵۵ء میں اکیس ارکان پر مشتمل ایک مجلسِ قانون ساز کی تشکیل عمل میں آئی، جس کے سربراہ چارلز کوپر تھے۔

کینیڈا کی آزاد حکومت کے قیام کے بعد آسٹریلیا میں بھی اسی درجے کی حکومت قائم کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ ۱۸۹۰ء کے بعد آسٹریلیا کی بستیوں کے کچھ سیاستدانوں نے اس غرض کے لیے چند اجلاس کیے تاکہ آسٹریلیا کی وفاقی حکومت کا آئین تیار کیا جائے۔ انھوں نے اسے آسٹریلیا کی دولت مشترکہ کا نام دیا۔

آسٹریلیا کے لوگوں نے اپنا آئین ریاست ہائے متحدہ کے نمونے پر تیار کیا۔ اس کے مطابق یہاں کی چھ نوآبادیاں چھ ریاستیں مانی گئیں۔ ہر ایک ریاست سے چھ چھ ارکان کی ایک سینیٹ بنانے کی تجویز کی گئی۔ اس غرض کے لیے مختلف ریاستوں کے رقبے اور ان کی آبادی کا کوئی لحاظ نہ کیا گیا۔ اس کے علاوہ ایک ایوانِ نمائندگان قائم کرنے کی تجویز بھی ہوئی جس کی تعداد ہر ریاست کی آبادی کے مطابق قرار پائی۔ لیکن صدر یا چنے ہوئے صدر کے بجائے انھوں نے برطانیہ کے بادشاہ یا ملکہ کو اپنے ملک کا حاکم اعلیٰ ماننا قبول کیا۔ اس کے مطابق ایوانِ نمائندگان اور سینیٹ کے منظور کردہ قوانین ملکہ کے نمائندہ یعنی آسٹریلیا کے گورنر جنرل کے دستخط کے بغیر ملک کے لیے قانون نہ بن سکتے تھے۔ اس طرح تمام طاقت حکومت کے ہاتھ میں چلی گئی یعنی وہ جماعت جس کی پارلیمان میں اکثریت ہو، ملک کی حاکم بن گئی۔

یہ طے ہوا کہ حکومت اپنے وزراء کی جماعت، پارلیمان کے چنے ہوئے ارکان میں سے لے گی اور ریاست ہائے متحدہ کی طرح پارلیمان سے باہر کوئی شخص وزارت کے لیے نہ چنا جائے گا۔ حکومت کا رکنِ اعلیٰ وزیر اعظم ہوگا۔ اگر کسی موقع پر وزراء کو پارلیمان کے چنے ہوئے ارکان کی اکثریت کی حمایت حاصل نہ رہے تو یہ حکومت فوراً استعفےٰ دینے پر مجبور ہوگی اور پارلیمان کے ارکان کا دوبارہ چناؤ ہوگا۔

وفاقی حکومت کو اس بات کا حق حاصل ہوگا کہ وہ غیر ملکی معاملات، ریاستوں کی باہمی تجارت، کسٹم اور ایکسائز، فوج، غیر ملکی معاملات، بنک، سکہ سازی، مبادلہ، شادی اور طلاق،

بڑھاپے کی پنشن، ڈاک اور جہاز رانی، ٹیلی فون اور ٹیلی گراف اور صنعتی معاملات کے متعلق قوانین بنا سکے۔

ہر ریاست اپنی انتظامی حکومت اور برطانیہ کے مقرر کردہ گورنر جنرل کی مدد سے اپنے حدود کے اندر ریلوے، عدالت، تعلیم اور تعمیراتِ عامہ کا انتظام کرتی تھی اور اسے زمین، صنعت و حرفت اور تجارت کے متعلق قوانین بنانے کا اختیار تھا۔ چنانچہ ریاستہائے متحدہ امریکہ کی طرح آسٹریلیا میں بھی مختلف ریاستوں کے حقوق کا مسئلہ بڑا اہم بن گیا۔ ملک کا آئین سارے ملک کے لوگوں کی رائے کے بغیر تبدیل نہ ہو سکتا تھا اور اس کے باوجود کہ اس عرصے میں کئی مرتبہ عوام کی رائے لی گئی، لیکن اصلی آئین میں کوئی خاص تبدیلی نہ ہو سکی۔

آئین کی مختلف باتوں کی وضاحت کا اختیار صرف آسٹریلیا کی ہائی کورٹ کے ہاتھ میں تھا۔ جس میں ایک چیف جج، چند جج ایک مقررہ تنخواہ پر ساری زندگی کے لیے مقرر کیے جاتے تھے۔

ستمبر ۱۹۰۰ء میں ملکہ وکٹوریہ نے اس ایکٹ پر دستخط کیے، جس سے آسٹریلیا کو سیاسی آزادی حاصل ہو گئی۔ بیسویں صدی کے پہلے دن یعنی یکم جنوری ۱۹۰۱ء کے روز اس جگہ جہاں اس سے ایک سو بارہ برس پہلے کپتان فلپ نے قدم رکھا تھا سڈنی کے ایک کھلے میدان میں آسٹریلیا کے دولتِ مشترکہ بننے کا اعلان کیا گیا۔ اس کے دو ہفتے بعد بوڑھی ملکہ نے وفات پائی۔ اس کے لمبے عہدِ حکومت میں آسٹریلیا کی آبادی، جنگ اور جنگ کی تباہیوں سے محفوظ رہتے ہوئے برطانیہ کی بری فوج اور بحریہ کی پناہ میں ڈھائی لاکھ سے چالیس لاکھ تک پہنچ چکی تھی۔ اس کا زیرِ کاشت علاقہ دو لاکھ ایکڑ سے دس کروڑ ایکڑ ہو گیا۔ اس میں سے ڈیڑھ کروڑ ایکڑ کے رقبے میں باغ لگائے گئے تھے۔ اس کی بھیڑوں کی تعداد ایک کروڑ سے گیارہ کروڑ تک پہنچ گئی تھی۔ صنعت کاروں

کی تعداد دو ہزار سے چار لاکھ ہو چکی تھی اور اس کی سالانہ تجارت پچاس لاکھ پونڈ سے دس کروڑ پونڈ تک پہنچ گئی تھی۔ سارے ملک میں تیرہ ہزار میل لمبی ریلوے لائن بھی بچھ چکی تھی۔

آسٹریلیا میں بہت سی ترقی ملکہ وکٹوریہ کے عہد میں ہوئی۔ بیسویں صدی کا زمانہ بہت سی جنگوں اور انقلابات کی وجہ سے اس نئے ملک کے لیے زیادہ اچھا نہ تھا، لیکن پھر بھی یہاں بہت تیزی سے ترقی کا کام جاری رہا۔

انیسواں باب

لوہا اور فولاد

سڈنی کو و میں پہلی آبادی قائم ہونے کے کچھ ماہ بعد یہاں سے چند میل شمال اور جنوب میں ساحل کے قریب کوئلا دریافت ہوا۔ اسے دریافت کرنے کے لیے زیادہ کوشش نہ کرنی پڑی۔ ساحل کے کنارے کھڑی چٹانوں کے شگافوں میں چمکتا ہوا کوئلا صاف دکھائی دیتا تھا۔ اس کے بعد آسٹریلیا کے بہت سے حصوں میں کوئلا دریافت ہوا۔ لیکن سڈنی کے قریب جو کوئلا پایا گیا وہ بہت اعلیٰ قسم کا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس حصّے میں طبقات الارض کا دباؤ کسی قدر زیادہ رہا، جس کی وجہ سے قدیم زمانے کے دلدلی علاقے کے نباتات ایسے عمدہ کوئلے میں تبدیل ہو گئے۔ سڈنی کے قریب کوئلہ نکالنے کے کام پر قیدیوں کو لگایا گیا۔ اور یہ کوئلہ بہت سے کام میں لایا جانے لگا۔ یہاں تک کہ انگلستان کو واپس جانے والے جہاز اپنا وزن درست رکھنے کے لیے بھی کوئلہ بھر لیتے۔ بعد میں ویلز اور لنکا شائر سے کان کن یہاں لائے گئے اور کوئلے کی کان کنی ایک بڑی صنعت بن گئی۔ ساحل سے لے کر ملک کے اندرونی حصّے تک کوئلے کی تیس تیس فٹ موٹی تہیں پائی گئیں، جس کے باعث انگلستان کی نسبت یہاں کوئلا نکالنے پر کم خرچ اور زیادہ نفع حاصل ہوتا تھا۔ آج کوئلے کی کان کنی آسٹریلیا کی ایک بہت بڑی صنعت ہے۔

اس خیال سے کہ یہ کوئلا فولاد کی صنعت میں استعمال کیا جا سکتا ہے بہت جلد لوہے کی تلاش شروع کی گئی۔ کئی مقامات پر تھوڑی تھوڑی مقدار میں لوہا ملا، لیکن لوہے کو کوئلے کی کانوں کے قریب لانے پر بہت خرچ آتا تھا۔ بروکن ہل کی حیرت انگیز کامیابی سے

آسٹریلیا کی فولاد کی صنعت شروع ہوئی۔ اس جگہ چاندی سے سیسے کو علیحدہ کرنے کے لیے ڈھلائی کے کام اور جست تیار کرنے کے لیے خاص کاریگروں کی ضرورت تھی۔ جن لوگوں نے بروکن ہل کی صنعت کو کامیاب بنایا، انھوں نے صنعت و حرفت کی دوسری چیزوں کے متعلق بھی سوچا اور آخرکار فولاد اور لوہا تیار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ جزیرہ نمائے آئر کے ساحل پر ایک چھوٹی پہاڑی میں بہت عمدہ قسم کا لوہا بڑی مقدار میں دریافت ہو گیا۔ کچی دھات اٹھانے والے جہاز انگلستان سے لائے گئے۔ جن کے ذریعے سے یہ لوہا نیو ساؤتھ ویلز کی کوئلے کی کانوں کے علاقے میں لایا گیا۔ نیو کیسل کے مقام پر فولاد کا پہلا کارخانہ قائم کیا گیا۔ اس جگہ کو یہ نام انگلستان والے مشہور کوئلہ خیز شہر کی تقلید میں دیا گیا۔ فولاد کے کارخانے قائم کرنا بہت ہمت کا کام تھا، کیونکہ اس کے لیے سارا سامان انگلستان سے بنوا کر لایا گیا۔ اس طرح بروکن ہل پروپرائٹری کمپنی نے ۱۹۱۵ء میں کچی دھات میں سے لوہے کا ایک ڈلا پہلی بار تیار کیا۔ آج آسٹریلیا میں ہر سال تقریباً تیس لاکھ ٹن لوہا اور فولاد تیار ہوتا ہے۔

فولاد کے تیار ہونے سے یہاں بہت سی اور ایسی صنعتیں بھی قائم ہو گئیں جن کا دار و مدار لوہے اور فولاد پر ہوتا ہے۔ ریلوے لائنوں کے لیے فولاد کی پٹریاں تیار ہونے لگیں اور انھی کی بدولت ملک میں ریلوے لائنیں بچھنے لگیں۔ زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ ریل کے انجن بھی تیار ہونے لگے۔ شکن دار اور قلعی کی ہوئی، لوہے کی چادریں لاکھوں مکانوں کی چھتوں کے لیے استعمال ہونے لگیں۔ فولاد کے تاروں سے یہاں کے مویشی پالنے والوں نے اپنی وسیع زمینوں کے گرد باڑیں لگوائیں اور اچھی چراگاہوں میں خرگوشوں کو داخل ہونے سے روکنے کے لیے تاروں کی جالیاں استعمال ہونے لگیں۔ پل بنائے گئے، مشینوں کے اوزار تیار ہوئے اور جدید طرز کی عمارتیں بننے لگیں۔

ریاست ہائے متحدہ امریکا کے موٹریں تیار کرنے والوں نے کینیڈا کی طرح آسٹریلیا میں بھی

اپنے کارخانوں کی شاخیں جاری کیں، جن میں یہاں کا فولاد استعمال کیا جاتا تھا۔ اور سوائے چند ایک چیزوں کے باقی سب سامان اسی جگہ تیار ہونے لگا۔ امریکا کے انجینئروں سے سیکھنے کے بعد اب آسٹریلیا اپنے طرز کی موٹریں خود تیار کرتا ہے۔ ہولڈن کاریں آسٹریلیا ہی میں تیار ہوتی ہیں۔ یہ ریاستہائے متحدہ امریکا کی عام کاروں سے زیادہ مضبوط اور زمین سے زیادہ اونچی ہوتی ہیں اور آسٹریلیا کی عام سڑکوں اور راستوں کے لیے زیادہ موزوں ہیں۔ اب خنک ساز (ریفریجریٹر) بجلی کا ہر قسم کا سامان، ریڈیو سیٹ، سلائی کی مشینیں اور پیانو بھی یہاں تیار ہونے لگے ہیں۔ آسٹریلیا کے جہاز سازی کے کارخانوں میں بارہ ہزار ٹن تک سامان بردار بحری جہاز بھی بننے لگے ہیں۔ ہوائی جہازوں کے کارخانوں میں ہلکی قسم کے بم گرانے والے اور لڑاکا جہاز بنائے جاتے ہیں۔ کپڑوں کے کارخانوں میں ہر قسم کا کپڑا تیار ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ اخباروں کا کاغذ، موٹروں کے ٹائر، پلاسٹک کی چیزیں، جوتے، فرنیچر، دوائیں، الکحل اور مختلف اقسام کی کیمیاوی اشیاء بھی بنائی جاتی ہیں۔

مقامی صنعت و حرفت میں اس قدر ترقی کے باوجود آسٹریلیا میں، اب بھی بہت سا کارخانوں کا بنا ہوا سامان باہر سے منگوایا جاتا ہے اور چند ضروری خام اشیا مثلاً تیل، تمباکو اور کپاس وغیرہ باہر سے آتے ہیں۔ اگرچہ آسٹریلیا کے شمال میں، اس کے قریب ہی جزائر شرق الہند میں معدنی تیل کافی مقدار میں موجود ہے، لیکن آسٹریلیا میں تیل کی دریافت میں اب تک کامیابی نہیں ہو سکی۔

امریکا کے بعد آسٹریلیا کے کارکن دنیا کے دوسرے تمام ملکوں سے بہتر زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کی ترقی کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ آسٹریلیا ان ملکوں میں شامل نہیں، جو ریاستہائے متحدہ امریکا سے مالی امداد حاصل کرتے ہیں۔ آسٹریلیا مارشل پلان کے ممالک میں نہیں ہے۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران میں آسٹریلیا اور ریاستہائے متحدہ کے درمیان کچھ لین دین کا سلسلہ جاری رہا، لیکن ان معاملات میں آسٹریلیا کے بجائے ریاستہائے متحدہ امریکا

نے ہی اس ملک سے استفادہ کیا۔

آسٹریلیا اور ریاستہائے متحدہ امریکا کے درمیان زیادہ تجارت نہ ہونے کی وجہ صرف یہ ہے کہ اُون اور یورینیم کی قسم کی چند کمیاب دھاتوں کے سوا اور کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو ریاستہائے متحدہ امریکا میں موجود نہ ہو اور اسے آسٹریلیا سے منگوانے کی ضرورت ہو۔ اس کے برعکس ریاستہائے متحدہ امریکا کے پاس بعض ایسی چیزیں ہیں مثلاً بھاری مشینیں، زمین کھودنے کے آلات وغیرہ، جن سے آسٹریلیا فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ خیال کیا جا سکتا ہے کہ آئندہ چند سالوں میں آسٹریلیا اور ریاستہائے متحدہ امریکا کے درمیان تجارتی تعلقات بڑھ جائیں گے۔

بیسواں باب

دُنیا کے لیے خوراک

آج سے بہت پہلے انگلستان کی کیمبرج یونیورسٹی کا ایک نوجوان، ریاضیات کا پروفیسر ولیم فارر آسٹریلیا میں آیا اور یہاں کچھ عرصہ مساحت (سروے) کا کام کرنے کے بعد کاشتکاری میں مصروف ہو گیا۔ اس نے یہ محسوس کیا کہ جو گندم اس نے بوئی تھی وہ یہاں کے گرم خشک موسم کے لیے موزوں نہ تھی۔ موسمِ بہار کے آخری حصے اور گرمیوں کے خشک موسم کی وجہ سے یہ مرجھا جاتی تھی۔ اگر موسمِ بہار میں زیادہ بارش ہو جائے تو مرطوب موسم کی وجہ سے اس کی فصل کو ایک خاص بیماری لگ جاتی تھی۔ فارر نے گندم کے مختلف نمونوں کو یہاں آزمانا اور ان میں سے اچھی قسم کے دانوں کو چُننا شروع کیا۔ کئی سال تک ایسا کرنے کے بعد اس نے گندم کی ایک ایسی قسم حاصل کر لی جو آسٹریلیا کے جغرافیائی حالات کے لیے خاص طور پر موزوں تھی اور غذائی نقطۂ نظر سے بھی بہت عمدہ تھی۔

اس وقت جب آسٹریلیا میں پہلی وفاقی حکومت قائم ہوئی فارر کی دریافت کردہ گندم آسٹریلیا کے بہت سے ایسے حصوں میں بوئی جانے لگی تھی، جہاں پہلے گندم کا پیدا ہونا ناممکن خیال کیا جاتا تھا۔ گندم کی جو قسم فارر نے دریافت کی تھی اسے "فیڈریشن" کا نام دیا گیا۔ یہ ایک عجیب واقعہ ہے کہ وہ جگہ جہاں اس نے اپنے فارم میں آخری تجربات کیے تھے، بعد میں آسٹریلیا کے وفاقی دارالحکومت کینبرا کے لیے چُنی گئی۔

دوسرے کسانوں نے فیڈریشن قسم کی گندم کو اور بہتر بنا لیا اور زیادہ عرصہ نہ گزرنے پایا تھا کہ آسٹریلیا دنیا کے بڑے گندم خیز ممالک میں شمار ہونے لگا۔ دوسری جنگِ عظیم کے وقت

تک آسٹریلیا میں پینتالیس لاکھ ٹن سالانہ کے قریب گندم پیدا کی جاتی تھی، جس کا تقریباً دو تہائی حصّہ ان دوسرے ممالک کو بھیج دیا جاتا تھا، جہاں غذا کی کمی تھی۔ اگرچہ گندم پیدا کرنے والے ملکوں کی فہرست میں آسٹریلیا کا نام دسویں نمبر پر تھا، لیکن گندم برآمد کرنے والے ممالک میں یہ چوتھے نمبر پر شمار ہوتا تھا۔

برّاعظم آسٹریلیا کے خاص درختوں میں سے کوئی بھی ایسا نہیں، جس میں کھانے کے قابل پھل آتے ہوں۔ صرف ایک ایسا درخت ہے جس میں ایسی پھلیاں یا سخت پوست کا ایک گری دار میوہ لگتا ہے جو کھانے کے قابل ہے لیکن یہاں بسنے والے شروع ہی میں انگلستان سے پھل دار پودے اور بیج اپنے ساتھ لے آئے۔ زیادہ سال نہ گزرے کہ آسٹریلیا کے بہت سے حصوں میں نہایت عمدہ پھل دار باغ نظر آنے لگے۔ آج یہاں پھلوں کا پیدا کرنا ایک اہم ملکی صنعت ہے۔ اس وقت یہاں سیب، ناشپاتیاں، آڑو، شفتالو، آلو بخارا، آلوچہ، لوکاٹ، بہی، چیری، لوگن بیری، سٹرابیری، لیموں اور مختلف اقسام کے گری دار پھل بکثرت پیدا کیے جاتے ہیں۔ یہاں ایک اور پھل بھی ہوتا ہے جو دنیا میں اور کسی جگہ نہیں ملتا۔ اسے پیشن فروٹ کہتے ہیں۔ اس کا چمکدار پھول صلیبی شکل کا ہوتا ہے۔ یہ پہلے بحرالکاہل کے جزیروں سے یہاں لایا گیا اور کوشش سے اسے زیادہ بہتر بنا لیا گیا۔ اس سے نہایت عمدہ قسم کا اور پھلوں کا دل پسند سلاد بنایا جاتا ہے۔ کوئینز لینڈ کے شمالی منطقۂ حارہ کے علاقے میں اناس، کیلا، پپیتا، ایک خاص قسم کی ناشپاتی، آم اور ناریل کی قسم کے پھل تجارت کی غرض سے بکثرت پیدا کیے جاتے ہیں۔ ان اضلاع میں جہاں دریائے مرے سے آبپاشی کی جاتی ہے، ہر قسم کے رس دار پھل اور زیتون بھی پیدا ہوتے ہیں۔ جنوبی آسٹریلیا میں انگور اور بادام بھی کافی مقدار میں ہوتے ہیں۔

چونکہ آسٹریلیا کا ملک دنیا کی اکثر منڈیوں سے دُور ہے اور تازہ پھل برآمد کرنے کے لیے اسے سرد آبے والے جہازوں کی ضرورت ہے۔ اس لیے جنگِ عظیم کے دوران میں بہت

سے جہازوں کے تباہ ہو جانے سے اس تجارت کو بڑا نقصان پہنچا۔ مثلاً جب دشمن کی آبدوز کشتیوں نے اس کے خنک ساز جہازوں کو غرق کر دیا تو اسے مجبوراً ہزاروں ایکڑ سیبوں کے باغوں کو تباہ کرنا پڑا۔ تاہم آسٹریلیا کے پھل پیدا کرنے والوں نے اپنے کام کو جاری رکھا اور پھلوں کو ڈبوں میں بند کرنے اور انھیں منجمد کرنے کی صنعت کو امریکا کی طرح' اگرچہ چھوٹے پیمانے پر' ترقی دی گئی۔

آسٹریلیا میں انگور پیدا کرنے کی صنعت پچاس ساٹھ سال سے کافی ترقی پر ہے۔ اس سے یہاں ہر سال چار کروڑ گیلن مختلف اقسام کی انگوری شراب تیار ہوتی ہے شراب کی بعض قسمیں بہت عمدہ خیال کی جاتی ہیں۔ اگرچہ ان میں سے اکثر کو عام فرانسیسی نام دیے گئے ہیں' لیکن یہ ان سے قدرے مختلف ہیں اور ان کی اپنی الگ ہی قسمیں ہیں۔ تازہ انگور بہت عمدہ ہوتے ہیں اور کافی سستے ملتے ہیں۔ ان کے علاوہ ستّر ہزار ٹن سے زیادہ خشک انگور اور کشمکش بھی حاصل ہوتی ہے۔

شمالی آسٹریلیا میں شکر تیار کرنے سے ایک ارب ڈالر کا نفع حاصل ہوتا ہے۔ یہاں ہزاروں کاشتکار گنّا پیدا کرتے ہیں اور "کولونیل شوگر ریفائننگ کمپنی" اور دوسری چھوٹی کمپنیوں نے مل کر شکر سازی کا ایک نہایت عمدہ نظام قائم کیا ہے۔ ان کی ملوں میں ہر سال قریباً دس لاکھ ٹن شکر تیار ہوتی ہے۔ جس میں سے نصف کے قریب برآمد کر دی جاتی ہے۔ اس صنعت سے الکحل، شیرہ اور عمارتی بورڈ ضمناً حاصل ہوتے ہیں۔

آسٹریلیا کے ڈیری فارموں سے دودھ، مکھن' پنیر اور گوشت حاصل کیا جاتا ہے۔ یہ اس ملک کی بہت کامیاب صنعت ہے' جس میں تقریباً ستّر ہزار لوگ ڈیری کے کام میں اور تیس ہزار اس کے متعلقہ فارموں میں مستقل طور پر مصروف رہتے ہیں۔ آسٹریلیا میں ساڑھے تین ہزار فارم ہیں' جن میں سے اکثر میں سو سے زیادہ گائیں ہوتی ہیں۔ یہاں تیس لاکھ سے زیادہ دودھ دینے والی گائیں موجود ہیں۔ آسٹریلیا میں کوشش سے ایک خاص

نسل کی گائیں حاصل کی گئی ہیں لیکن عام اچھی قسم کی گائیں بھی ان فارموں میں پائی جاتی ہیں۔
دودھ سے مختلف چیزیں تیار کرنا ایک خاص فن ہے اور یہاں اس سے خشک دودھ، مالٹ آمیز دودھ، دودھ کی شکر اور ملائی دار خشک دودھ ہر سال بہ مقدارِ کثیر تیار کیا جاتا ہے، اس کا بیشتر حصہ برآمد ہو جاتا ہے۔ ہر سال سیکڑوں ٹن پنیر بھی تیار کیا جاتا ہے، جس میں سے نصف سے کچھ کم دنیا کے دوسرے ملکوں کے لیے ہوتا ہے۔

آسٹریلیا کے لوگ گوشت بکثرت کھاتے ہیں۔ یہاں گوشت ہمیشہ کافی مقدار میں اور سستا ملتا رہا ہے۔ اچھے زمانے میں کوئی آسٹریلوی کام کرنے والا ایسا نہیں ہوتا جسے جی بھر کر کھانے کو گائے یا بکری کے عمدہ ٹکڑے نہ مل سکیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آسٹریلیا گوشت پیدا کرنے کی صنعت میں دنیا بھر سے آگے ہے۔

۱۷۸۸ء میں یہاں آباد ہونے کے لیے آنے والے اولین باشندے اپنے ساتھ آٹھ مویشی لائے۔ چونکہ یہاں گوشت خور درندے نہ پائے جاتے تھے اور زہریلے کیڑے مکوڑے بھی نہ تھے، اس لیے انھوں نے ترقی کی اور بڑھتے چلے گئے۔ شروع کے چرواہے اپنے مویشیوں اور بھیڑوں کو ہانکتے ہوئے، پہاڑوں پر سے گزر کر زرخیز میدانوں میں لے گئے۔ ۱۸۶۹ء میں نہر سویز کے بن جانے سے اور دخانی جہازوں اور سرد خانوں کی بدولت آسٹریلیا کا گوشت دنیا کے دور دراز حصوں میں پہنچنے لگا۔ اس وقت اس برِ اعظم میں ایک کروڑ پینسٹھ لاکھ مویشی موجود ہیں، جن میں سے دو تہائی نہایت فربہ قسم کے جانور صرف گوشت کے لیے پالے جاتے ہیں۔

مویشیوں کے مرکز یا احاطے آسٹریلیا کے ہر حصے میں پائے جاتے ہیں بلکہ اندرونی خشک علاقوں میں بھی موجود ہیں لیکن مویشی اس کے شمال مشرقی بلند علاقے کے وسط میں اور شمالی مون سون کے گرم علاقوں کے مرغزاروں میں زیادہ پالے جاتے ہیں۔ اکثر جانوروں کے احاطے بڑے وسیع ہوتے ہیں۔ ان میں سے بعض دس لاکھ ایکڑ سے بھی زیادہ رقبے

کے ہیں جن میں مویشی آزادی کے ساتھ گھومتے پھرتے ہیں۔ یہاں ان کو "گوالے لڑکے" بھی اکٹھا نہیں کر سکتے لہٰذا یہ کام مویشیوں کو گھیرنے والے سٹاک مین کرتے ہیں جن میں سے اکثر یہاں کے اصلی باشندوں کی اولاد ہیں۔ ان احاطوں میں جانوروں کی پیٹھ پر ایک نشان لگا دیا جاتا ہے۔ جس سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ کون سے احاطے کی ملکیت ہیں لیکن بہت سے جانوروں پر کوئی نشان نہیں ہوتا۔ سٹاک مین انھیں ڈھونڈ کر علیحدہ کر لیتے ہیں۔

آسٹریلیا ہر سال دس لاکھ ٹن سے زیادہ گوشت پیدا کرتا ہے۔ دوسری جنگِ عظیم سے پہلے اس کا ایک تہائی حصّہ برآمد کیا جاتا تھا، لیکن پچھلے چند سال میں ملکی ضرورت بڑھ جانے کی وجہ سے اب ڈبّوں کے بند گوشت، منجمد گوشت اور خشک گوشت کی برآمد میں کمی واقع ہو گئی ہے۔

مذکورہ بالا سے معلوم ہو سکتا ہے کہ آسٹریلیا سے دنیا کو بہت زیادہ مقدار میں سامانِ خوراک حاصل ہوتا ہے تاہم یہاں کی پیداوار میں بعض رکاوٹیں بھی ہیں۔ یہاں کی سرزمین دنیا کے دوسرے حصوں سے بہت مختلف ہے اور یہ جگہ دنیا کی منڈیوں سے بھی بہت دور اور الگ تھلگ ہے لیکن آسٹریلیا کے لوگوں نے زمین کے نقائص اور آب وہوا کا بہت بہادری سے مقابلہ کیا اور انھیں اسے زیادہ سے زیادہ زرخیز بنانے میں کافی کامیابی ہوئی۔

اُن کی ان کوششوں میں کامیابی حاصل ہونے کے کئی وجوہ ہیں جو دنیا میں اور کسی جگہ میسّر نہیں۔ اس کی پہلی وجہ یہ ہے کہ آسٹریلیا کا کسان یا مویشی پالنے والا ہر بات میں اپنی ذات کے لیے خود ذمہ دار ہے۔ ولیم فارر کی طرح وہ خود سب سے پہلے اپنی زمین پر پہنچا ہے اور اس نے خود اپنی خاص ضروریات کو محسوس کر کے اس کا بندوبست کیا ہے۔ آج زمین اس کی ہے اور وہ موجودہ سائنسی ترقی سے پوری طرح باخبر ہے اور ایک امریکی کسان کی طرح موجودہ ترقی یافتہ مشینوں کا استعمال کرتا ہے البتہ یہاں بجلی کی قوّت

امریکی کسان کی طرح میسر نہیں اور پٹرول اور گیسولین بھی سستے داموں حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس نے بہت سی زراعتی مشینوں کا استعمال دوسروں سے پہلے شروع کیا۔ فصل کاٹنے کی ایک مخلوط مشین آسٹریلیا کی ایجاد ہے جو ۱۸۸۰ء میں تیار کی گئی۔ جب وہ وکٹوریا کے علاقے میں یوکلپٹس کے جنگلوں کو صاف کرنے میں مصروف ہوا تو یہاں زمین کے اندر چھپی ہوئی جڑوں کو نکالنے کے لیے ایک خاص قسم کا ہل بنایا۔ یہاں زمین میں جا بجا اس کثرت سے جڑیں موجود تھیں کہ اس کا صاف کرنا سخت مشکل تھا۔ اس نئے ہل کی بدولت یہ کام بڑا آسان ہو گیا۔ ان جنگلوں کو صاف کرنے میں اسے بڑی محنت سے کام کرنا پڑا۔ شروع میں ان درختوں کو کاٹنے کے لیے اور زمین صاف کرنے کے لیے اس کے پاس کلھاڑے، کدال، بیلچے، کھرپے اور لوہے کی سلاخوں کے سوا اور کوئی چیز نہ تھی۔ آج کل زمین کو صاف کرنے کے لیے عام طور پر ٹھیکا دے دیا جاتا ہے اور جنگل صاف کرنے والی جماعتیں آسٹریلیا میں تیار کیے ہوئے مختلف آلات مثلاً بلڈوزروں، پٹرولی ٹریکٹروں اور ڈیزل کی بارگیروں (کرینوں) سے اسے بہت تھوڑے عرصے میں صاف کر دیتی ہیں۔

آسٹریلیا کی فارموں کی ترقی میں دوسری اہم چیز وہاں کی حکومت ہے۔ یہاں کے کسانوں نے اجتماعی فارموں کی طرف کبھی توجہ نہیں کی لیکن وہ امداد باہمی کے کاموں کو ضرور پسند کرتے ہیں۔ کیونکہ دور دراز علاقوں میں امدادِ باہمی ان کے لیے بہت مفید ہو سکتی ہے۔ آسٹریلیا کی تاریخ کے عین آغاز میں اکثر ریاستوں نے اپنے کسانوں کو امداد باہمی کے متعلق بتانے کی اور ان کی رہنمائی کرنے کی کوشش کی۔ آج کل حکومت ہر کسان کے کاموں میں برابر کی شریک ہے۔ اس سے کسی کسان کی ذاتی آزادی میں کچھ فرق نہیں آتا لیکن وہ اس سے بہت سا فائدہ اٹھاتا ہے۔ حکومت اکثر کسانوں کو ان کی پیداوار فروخت کرنے میں مدد دیتی ہے۔ انھیں مناسب قیمت کا ملنا یقینی ہوتا ہے۔ حکومت کسانوں کو یہ بھی بتاتی ہے کہ انھیں ہر ایک فصل کس قدر بونی چاہیے۔ شروع میں کسانوں نے اس بات کو پسند نہ کیا لیکن اب انھیں یہ معلوم ہو گیا

ہے کہ فارموں کی ضرورت سے زیادہ پیداوار کو روکنے کا یہی ایک طریقہ ہے۔

حکومت دولت مشترکہ بنک کی معرفت کسانوں کو قرضے بھی دیتی ہے تاکہ وہ اس سے اپنی زراعت کو ترقی دے سکیں۔ کسانوں کے سامان، بیج اور ان کے اوزاروں کو بہتر بنانے کے لیے بھی حکومت نے الگ الگ محکمے قائم کیے ہیں۔ ان وباؤں یا آفات کا بھی مقابلہ کیا جاتا ہے جن سے کسانوں کو کسی قسم کی اذیت پہنچنے کا امکان ہو لیکن اس کے ساتھ ہی حکومت کو ایسے کسانوں کو سزا دینے کا حق ہے جو ضرر رساں پودوں، فصلوں کی بیماریوں اور فصلوں کو نقصان پہنچانے والے جانوروں کو روکنے کی کوشش نہیں کرتے۔ اکثر ریاستوں کی حکومتیں ریلوں کے ذریعے سے کسانوں کو سستے ذرائع نقل و حمل مہیا کرتی ہیں اور نئے علاقوں کو صاف کرنے میں اور انھیں ترقی دینے میں ان کو مدد پہنچاتی ہیں۔ بہت سی اور باتوں کے لیے بھی آسٹریلیا کا کسان اپنی ریاست اور وفاقی حکومت پر بھروسا کرنے کا عادی ہو چکا ہے۔

اکیسواں باب

زبان اور رسم و رواج

اب تک جو کچھ بتایا گیا ہے اسے پڑھ کر ایک عام آسٹریلوی کی زندگی کے متعلق بہت کچھ معلوم ہو سکتا ہے۔ یہ بات صاف ظاہر ہے کہ یہاں کے لوگ سخت لیکن آزادانہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کے رہنے کے لیے وسیع میدان اور کھلی جگہیں ہیں۔ وہ لوگ جو شہروں میں رہتے ہیں، انھیں بھی تازہ ہوا اور سورج کی روشنی میسّر ہے۔ بعض بڑے شہروں میں کچھ لوگ کرائے کے مکانوں میں رہتے ہیں لیکن امریکا اور پرانی دنیا کے اکثر ممالک کے شہروں کی نسبت یہ طریقہ یہاں بہت کم ہے۔ اس ملک کے شہر بہت رقبے میں پھیلے ہوئے ہیں اور شہر کے قریب کی بستیوں کے تمام مکانات کے ساتھ کھلے صحن ہوتے ہیں جن کے گرد باڑ ہوتی ہے۔ اگرچہ آسٹریلیا کے بعض لوگ اس بات سے اتفاق نہ کریں گے لیکن اس ملک کے سب رہنے والے ایک ہی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اور ان میں ادنےٰ اور اعلیٰ کا چنداں امتیاز نہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض لوگوں کے پاس دوسروں کی نسبت زیادہ دولت ہے لیکن یہ بتانا مشکل ہے کہ وہ کون ہیں۔ آسٹریلیا کا ہر باشندہ اپنے آپ کو دوسرے ہر آسٹریلوی شہری کے برابر سمجھتا ہے۔ سوسائٹی کے تمام رسم و رواج اسی اصول پر قائم ہیں۔

یہ خیال کرتے ہوئے کہ آسٹریلیا ایک نیا ملک ہے اس بات کو دیکھ کر بڑا تعجب ہوتا ہے کہ تمام ملک میں یہاں کے لوگوں میں بڑی یکسانی پائی جاتی ہے۔ علم اقتصادیات کے ماہروں کا کہنا ہے کہ سارے برّاعظم میں لوگوں کا معیارِ زندگی ایک جیسا ہے اور کسی موقع

پر بھی اس کے کسی حصے میں طلب اور رسد میں چنداں فرق نہیں ہوتا۔ سڈنی اور پرتھ کے شہر ایک دوسرے سے تین ہزار میل دُور ہیں لیکن ان دونوں شہروں کے رہنے والے ایک ہی خاص لب و لہجے سے انگریزی بولتے ہیں ۔ ان کی گفتگو کے طریقے کو لہجہ نہیں کہا جاسکتا۔ ان کا طرزِ گفتار دوسروں سے بالکل نرالا ہے۔ کوئی اور اس کی نقل نہیں کرسکتا۔ پیشہ ور انگریز ایکٹر بھی اس لہجے یا طرز سے گفتگو نہیں کرسکتے اور اگر ریڈیو پر یا فلم میں کسی آسٹریلوی کا کردار ہو تو اسے ادا کرنے کے لیے وہیں کے کسی شخص کو یہ کام دیا جائے گا اور صرف وہی اس کردار کو ٹھیک طریقے سے ادا کرسکتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ آسٹریلیا کے لوگ لندن کے ادنیٰ طبقے کے لوگوں کی طرح بولتے ہیں لیکن یہ درست نہیں۔ اور یہ کہنا مشکل ہے کہ اس میں لندن کے باشندوں کی برائی یا توہین کی گئی ہے یا آسٹریلیا کے لوگوں کی ۔ غالباً آسٹریلیا والوں کا گفتگو کا لہجہ وہی ہے جو انیسویں صدی میں انگلستان کے نچلے درجے کے لوگوں کا تھا جو یہاں آنے پر تھوڑا سا مختلف ہو گیا۔ آسٹریلیا کے لوگ صرف ذرا آہستہ بولتے ہیں ۔ یہ لوگ انگریزی حرف "آئی" کی آواز کو اسی طرح تھوڑی سی دقت کے ساتھ ادا کرتے ہیں جس طرح وسطی انگلستان کے دیہاتی اس کو ادا کرنے میں محسوس کرتے ہیں۔

آسٹریلیا کے تقریباً تمام رہنے والے اہلِ برطانیہ کی نسل سے ہیں۔ اگرچہ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ اس ملک کو برطانیہ والوں نے دریافت کیا اور وہی اس جگہ سب سے پہلے پہنچے لیکن اس کی دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ انیسویں صدی کے دوران میں بعض وجوہ سے یورپ کے دوسرے ممالک والے یہاں زیادہ نہ آسکے۔ ان دنوں ہر شخص کی توجہ امریکا کی طرف تھی ۔ امریکا کی نسبت یورپ سے آسٹریلیا کا سفر چار گنا لمبا تھا اور اس پر خرچ بھی چوگنا آتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی عام لوگوں کو اس عجیب ملک کے حالات کا بھی چنداں علم نہ تھا۔ اس کے علاوہ آسٹریلیا آنے والے اکثر بحری جہاز صرف لندن یا لور پول سے روانہ ہوتے تھے ۔ جنگ کے بعد تقریباً دس لاکھ اشخاص یہاں ایسے آئے جن میں نصف کے قریب

برطانیہ کے علاوہ دوسرے یورپین ملکوں کے تھے لیکن پھر بھی یہاں کی آبادی کا نوّے فی صد حصّہ اہلِ برطانیہ کی نسل سے ہے البتہ آسٹریلیا کے نئے لوگوں کے آنے سے یہاں کچھ تبدیلیاں ضرور ہوئیں۔ ایک ایسا وقت تھا کہ آسٹریلیا کے کسی شہر میں بھی انگریزی کے سوا کوئی اور دوسری زبان سننے میں نہ آتی تھی۔ اب اکثر جگہ دوسری زبانیں بھی سنائی دیتی ہیں اور بڑی بڑی دکانیں برطانیہ کے لوگوں کے علاوہ دوسروں کی خاطر اپنے سائن بورڈ مختلف زبانوں میں لکھوا کر لٹکاتی ہیں۔ یورپ کے دوسرے ملکوں سے کچھ اور رسم و رواج اور کھانے بھی آسٹریلیا میں پہنچ گئے اور ان تمام باتوں سے آسٹریلیا کی تمدنی زندگی زیادہ وسیع ہو گئی اور اسے ان چیزوں سے بڑا فائدہ پہنچا۔

آسٹریلیا میں چند دوسرے ملکوں کی جماعتیں اور بستیاں بھی ہیں۔ جنوبی آسٹریلیا کی دریافت کے کچھ عرصہ بعد ہی جرمنی کے کچھ پروٹسٹنٹ لوگ جو مارٹن لوتھر کے پیرو ہیں ایڈی لیڈ کے شمال میں تھوڑے فاصلے پر ایک بستی میں آباد ہو گئے اور یہاں شراب کے لیے انگور کی کاشت کرنے لگے۔ ان لوگوں کی اولاد اب بھی وہاں آباد ہے اور آسٹریلیا کی شراب کی روز افزوں صنعت زیادہ تر انھی کے ہاتھ میں ہے۔ اگرچہ پچھلی دو جنگوں میں جن میں جرمنی آسٹریلیا کا دشمن تھا وہ قدرے گھبراہٹ محسوس کرتے رہے لیکن وہ بڑی سختی سے آسٹریلیا کے وفادار ہیں اور یہاں کی سمندر پار فوجوں میں شامل ہو کر بڑی بہادری سے لڑتے رہے۔

پچھلے چند سال میں اٹلی کے باشندوں کی ایک بڑی تعداد کوئینز لینڈ کے شمالی حصے میں آکر بس گئی۔ یہاں اس علاقے کی صنعت شکر سازی میں ان کا بڑا حصّہ ہے۔ ان کے علاوہ آسٹریلیا میں اگر کسی اور قوم یا ملک کے کچھ لوگ آباد ہیں تو وہ صرف چینی ہیں۔ یہ تقریباً ہر بڑے شہر میں تھوڑی سی تعداد میں پائے جاتے ہیں اور ان کا بڑا پیشہ باغبانی یا فرنیچر بنانا ہے۔ یہ نہایت پُر امن لوگ ہیں جو اپنے رسم و رواج اور زبان برتتے ہیں۔ آسٹریلیا کے لوگوں کے ساتھ ان کے تعلقات بڑے دوستانہ ہیں۔ فی الحال چینی قوم کے مزید افراد

کا داخلہ آسٹریلیا میں قانوناً بند کر دیا گیا ہے۔

جب سونا دریافت ہوا اور ہر جگہ سے لوگ بڑی تعداد میں یہاں پہنچے تو تقریباً تیس ہزار چینی مزدور بھی یہاں چلے آئے۔ یہ زیادہ تر برطانیہ کی نوآبادی سنگاپور سے یہاں کان کنوں کے ساتھ آئے۔ بعض دفعہ ان مزدوروں اور کان کنوں کے درمیان کچھ لڑائی جھگڑے بھی ہوئے، جن کی بڑی وجہ صرف یہ تھی کہ چینی لوگ سونے کی کانوں کے علاقے میں مقامی قوانین کی پابندیاں نہ کرتے تھے اور شاید اس لیے بھی کہ وہ دوسرے مزدوروں کے بہ مقابلہ زیادہ محنت کر سکتے تھے۔ ان جھگڑوں کے بعد انھیں ملک سے علیحدہ کرنے کی کوشش شروع ہو گئی۔ جب ۱۸۸۰ء اور ۱۸۹۰ء کے درمیان آسٹریلیا کے مزدوروں کی انجمنیں قائم ہوئیں تو انھیں علیحدہ کرنے کی تحریک اور زیادہ بڑھ گئی۔ مویشی والوں اور زمین کے مالکوں نے اس بات کی کوشش بھی کی کہ وہ قیدیوں اور غلاموں کے بجائے ہندوستان یا سنگاپور سے کچھ مزدور لے آئیں۔ انیسویں صدی کے نصف آخر میں بحیرۂ جنوبی کے جزیروں کے کچھ لوگ بھی شمالی کوئنز لینڈ کے گنے کے کھیتوں میں کام کرنے کے لیے لائے گئے۔ ان کو کاناکاس کہتے ہیں۔ اگرچہ ان کو بھی یہی مزدوری دی جاتی تھی، لیکن وہ غلاموں سے بہتر ثابت نہ ہوئے۔ اس زمانے میں امریکا میں خانہ جنگی جاری تھی، جس کے اثر سے بہت سے لوگ اور خاص طور پر آسٹریلیا کی تجارتی انجمنیں سیاہ فام مزدوروں کو ملک میں لانے کے خلاف تھیں، اس غرض کے لیے ایک بہت بڑی تحریک جاری کی گئی۔ چنانچہ ۱۹۰۲ء میں وفاقی حکومت نے جو قوانین نافذ کیے ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ ایشیائی نسل کے لوگ یہاں نہیں آ سکتے۔ چونکہ آسٹریلیا کی بستی کے بڑے بڑے زمیندار سلطنتِ برطانیہ کے ان حصوں سے سستے مزدور بہت آسانی سے لا سکتے تھے، اس لیے یہ قانون خاص طور پر اُن کو روکنے کے لیے بنایا گیا۔ طالب علموں، کاروباری لوگوں اور دوسرے ایسے لوگوں کے آنے کی ممانعت نہ تھی، جن سے آسٹریلیا کے باشندوں کو فائدہ حاصل ہو سکتا ہو۔ یہ قانون

جو "وہائٹ آسٹریلیا پالیسی" (سفید فام پالیسی) کہلاتا ہے آج بھی یہاں نافذ ہے۔

آسٹریلیا کے لوگ بڑے کھلاڑی ہیں۔ ان کے منظم کھیل انگلستان کے سے ہیں۔ موسم گرما کا بڑا کھیل کرکٹ ہے جو یہاں کے لوگ اسی جوش و خروش سے کھیلتے ہیں جیسے امریکا میں بیس بال کا کھیلا جاتا ہے۔ یہاں ہزاروں چھوٹے چھوٹے کرکٹ کلب قائم ہیں، جن کے ارکان اکثر ہفتے کی سہ پہر کو بڑی سرگرمی سے اس کھیل میں حصہ لیتے ہیں۔ انگلستان اور آسٹریلیا کے درمیان کرکٹ کے آزمائشی مقابلے ہوتے ہیں اور چونکہ آسٹریلیا کے لوگ بڑی محنت سے اس کھیل کی مشق کرتے ہیں اس لیے اکثر انگلستان کی ٹیموں کو ہرا دیتے ہیں۔

یہاں کے معتدل موسم کی وجہ سے ٹینس کا کھیل آسٹریلیا میں تمام سال کھیلا جاتا ہے۔ آسٹریلوی ڈیوس کپ ٹیمیں اکثر ٹینس کے مقابلوں میں فائنل اور سیمی فائنل میں پہنچ جاتی ہیں۔ اور ان میں اکثر آسٹریلیا کی ٹیمیں جیت جاتی ہیں۔ اس کھیل میں آسٹریلیا والوں کی کامیابی کی بڑی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ اسے بہت مستقل مزاجی اور جوش سے کھیلتے ہیں اور بہت زیادہ مشق کرتے ہیں۔ آسٹریلیا کے کھلے شہروں اور وسیع دیہاتی علاقوں میں ہزاروں ٹینس کورٹ آسانی سے بنائے جا سکتے ہیں، جہاں کہ ہر شخص کو کھیلنے کا موقع مل سکتا ہے۔ رات کے وقت کھلے میدان میں تیز روشنی میں ٹینس کھیلنا یہاں کے لوگوں کا بڑا پسندیدہ مشغلہ ہے۔

فٹ بال عام طور پر سردیوں میں کھیلا جاتا ہے۔ یہاں اس کھیل کی کئی قسمیں ہیں اور ان کے الگ الگ قاعدے اور اصول ہیں۔ ان میں دو رگبی کھیل کی بدلی ہوئی شکلیں ہیں۔ آسٹریلیا کا ایک خاص فٹ بال کھیل "آسٹریلین رولز" کہلاتا ہے جس میں دونوں طرف اٹھارہ اٹھارہ کھلاڑی ہوتے ہیں۔ یہ کھیل ایک بیضوی میدان میں کھیلا جاتا ہے جس کی لمبائی دو سو گز اور چوڑائی ڈیڑھ سو گز ہوتی ہے۔ یہاں اس کھیل میں گیند کو بہت زور سے ٹھوکر ماری جاتی ہے اور بلندی سے نیچے آتے وقت اسے پکڑ لیا جاتا ہے۔

ساحلِ سمندر پہ نہانا، تیرنا اور لہروں سے کھیلنا اس ملک کا قومی مشغلہ ہے جس سے سب

لطف اٹھاتے ہیں۔ ہر ریاست کے صدر مقام کے بہت قریب لمبے ریتیلے ساحلی علاقے موجود ہیں۔ بعض جگہ مثلاً سڈنی کے قریب ساحل پہ دیکھنے میں آتا ہے کہ سمندر کی لہریں بڑے جوش وخروش سے دُور تک لڑھکتی ہوئی آتی ہیں۔ یہاں کے ساحلوں پہ کسی کا نجی قبضہ نہیں ہے۔ لمبے ریتیلے ساحلی علاقے ہر ایک کے لیے کھلے ہیں۔ تختوں اور تختوں والے لمبے جُوتوں یا بہت چھوٹی کشتیوں میں لہروں پر سوار ہونے کے کھیل کھیلے جاتے ہیں۔ لیکن ان سب میں پسندیدہ کھیل باڈی سرفنگ ہے جس میں کھیلنے والا کسی دوسری چیز کی مدد کے بغیر آنے والی لہر کے اوپر سوار ہو جاتا ہے۔ چونکہ ایسے ساحلی کھیل خطرے سے خالی نہیں ہیں، اس لیے یہاں ڈوبنے والوں کو بچانے کے لیے خاص عملہ مقرر ہوتا ہے۔ ایک منظم جماعت ہر جگہ ساحلی علاقے میں موجود رہتی ہے۔ یہ جان بچانے والے نوجوان سب رضاکار ہوتے ہیں اور انھیں سمندر میں تیرنے کی بڑی مشق ہوتی ہے۔ ساحلوں پہ میلے اور جشن بھی منائے جاتے ہیں۔ اس وقت بہت سے ساحلی کلب ڈوبتوں کو بچانے کے مقابلے کرتے ہیں۔ تیرنے کے مقابلے بھی ہوتے ہیں جن کی وجہ سے یہاں بعض بہت عمدہ تیراک نکل آتے ہیں اور ان میں سے بعض اولمپک کھیلوں میں تیرنے کے مقابلوں میں جیت جاتے ہیں۔ بادبانی جہاز چلانا اور کشتیوں کی دوڑیں بھی ان لوگوں کے پسندیدہ کھیل ہیں۔ اس قسم کے مقابلے بعض اوقات بندرگاہوں میں اور کبھی کبھی ساحلِ سمندر پر ہوتے ہیں۔ سڈنی کی وسیع بندرگاہ ایسے کھیلوں کے لیے خاص طور پہ موزوں ہے، جہاں سیکڑوں کشتیاں اپنے سفید بادبانوں کے ساتھ ادھر ادھر تیرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

مشرقی آسٹریلیا کے دریاؤں اور ندیوں میں مچھلی پکڑنے کا مشغلہ بھی بڑا عام ہے جہاں کہ براون اور ریلنبو ٹراوٹ مچھلی بکثرت پائی جاتی ہے۔ یہاں کی ایک خاص تازہ پانی کی مچھلی جسے "مرے کاڈ" کہتے ہیں، سو پونڈ تک وزنی ہوتی ہے۔ آسٹریلیا میں شکار بہت محدود ہے جس کی وجہ صرف یہ ہے کہ یہاں شکار کے جانوروں کی کمی ہے۔ کنگارو کا شکار ہر موسم میں ہو سکتا ہے۔ شمالی علاقے میں پانی میں رہنے والی بھینسیں بھی چھوڑی گئی ہیں

جنھیں پیشہ ور شکاری کھال کے لیے شکار کرتے ہیں۔

ان تمام کھیلوں میں جن کو دیکھنے کے لیے تماشائی جمع ہوتے ہیں، سب سے زیادہ ہر دلعزیز گھوڑ دوڑ ہے۔ یہ کھیل یہاں اسی وقت سے جاری ہے جب یہاں کے اوّلین آبادکار اور مویشی پالنے والے میلوں اور تہواروں میں ایک دوسرے کے مقابلے میں گھوڑے دوڑایا کرتے تھے۔ انگلستان اور آئرلینڈ سے بہت اچھی نسل کے گھوڑے یہاں لاکر پالے گئے ہیں اور ان سے نہایت عمدہ گھوڑ دوڑ کے جانور تیار کیے گئے ہیں۔ ہر ریاست کے صدر مقام میں گھوڑ دوڑ کے تین یا چار میدان ہوتے ہیں جو سال کے بیشتر دنوں میں کھلے رہتے ہیں۔ سیدھی دوڑیں جو چار فرلانگ سے بارہ فرلانگ کی ہوتی ہیں زیادہ پسند کی جاتی ہیں۔ رکاوٹوں والی گھوڑ دوڑ اور دلکی چال کی دوڑوں کو زیادہ پسند نہیں کیا جاتا، البتہ رات کے وقت روشنی میں دُلکی چال کی دوڑیں زیادہ پسند کی جانے لگی ہیں۔ آسٹریلیا کی سب سے بڑی گھوڑ دوڑ میلبورن کپ کی دَوڑ ہے جو ہر سال نومبر کی دوسری جمعرات کو ہوتی ہے۔ اس روز میلبورن میں چھٹی منائی جاتی ہے اور اس دوڑ کے جیتنے والے کو پچیس ہزار ڈالر انعام ملتا ہے۔ آسٹریلیا کے لوگ عمدہ گھوڑوں کے بہت شوقین ہیں اور تمام صدر مقامات میں سالانہ زراعتی میلوں میں شہ سواری کے مقابلے ضرور ہوتے ہیں۔ ان کو "شاہی نمائش" کہا جاتا ہے اور لوگوں کے بڑے بڑے ہجوم انھیں دیکھنے کے لیے آتے ہیں۔

بائیسواں باب

آسٹریلیا جنگ اور امن میں

پہلی جنگِ عظیم سے چند سال پہلے آسٹریلیا کی نئی وفاقی حکومت نے ایک چھوٹی سی فوج اور بحری بیڑا تیار کر لیا تھا۔ جب جنگ شروع ہوئی تو اس فوج کا ایک حصّہ بحرالکاہل میں جرمن مقبوضات پر قبضہ کرنے کے لیے بھیجا گیا جس نے بڑی کامیابی سے اس مہم کو انجام دیا۔ آسٹریلیا کے بحریہ نے بہت تھوڑے عرصے میں جرمنی کی حملہ آور بحری فوج کو جنوب کے نصف کرّے سے بھگا دیا۔ اس کے بعد آسٹریلیا کی فوج کو نیوزی لینڈ کی فوج کے ساتھ ملا دیا گیا اور اس کا نام "آسٹریلین نیوزی لینڈ آرمی کور" رکھا گیا، جس کا مخفف اے۔ این۔ زیڈ۔ اے۔ سی یا "انزیک" رکھا گیا۔ یہ توانا اور تنومند سپاہیوں کی فوج تھی جو رسالے کے سپاہیوں کی طرح نیچے کو خمیدہ کنارے والی ہیٹ پہنتے تھے جن پر ایمو کے پروں کی کلغیاں لہراتی تھیں۔

"انزیک" کو مصر میں بھیجا گیا، جہاں ترک فوج نیل کے ڈیلٹے پر قبضہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ آسٹریلیا کی اس فوج کی مدد سے یہاں ترکوں کو شکست ہوئی۔ اس کے بعد انھیں ایک حملہ کرنے والی بڑی فوج میں شامل کر دیا گیا۔ یہ فوج جزیرہ نمائے گیلی پولی میں بھیجی گئی جو آبنائے درہ دانیال کے مغرب میں واقع ہے۔ جہاں باسفورس پر قبضہ کرنا مقصود تھا۔ آسٹریلیا کی فوج یہاں ۲۵, اپریل ۱۹۱۵ء کو صبح کے وقت پہنچی۔ آسٹریلیا میں یہ دن اب بھی یادگار کے طور پر منایا جاتا ہے، چونکہ ترکوں کو اس حملے کا علم ہو چکا تھا، اس لیے ان پر سخت گولہ باری کی گئی اور وہ صرف مصمم ارادے کی وجہ سے بہت بہادری سے لڑتے ہوئے آگے بڑھے۔ وہ بلند چٹان پر چڑھے اور انھوں نے ساحل سے ایک میل اندر

تک کے علاقے پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد چھ مہینوں تک سخت لڑائی ہوتی رہی۔ اس عرصے میں یہ معلوم ہو گیا کہ اس جزیرہ نما پر قبضہ نہیں ہو سکتا اور برطانوی فوج کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ اس مہم میں ساڑھے پینتیس ہزار سپاہی مارے گئے جن میں سے ایک تہائی "انزیک" تھے۔

"انزیک" فوج کو آسٹریلیا سے تازہ کمک آئی، بعض دستے بدلے بھی گئے۔ اس طرح جب اس کی تعداد کافی زیادہ ہو گئی تو اسے دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ سوار دستوں کو برطانوی فوج کے ساتھ ملا دیا گیا جو ترکوں کا مقابلہ کرتے ہوئے شام و فلسطین میں بڑھتے رہے اور بالآخر دولتِ عثمانیہ کے زوال کا سبب بنے۔ دوسرے حصے نے کلغی دار ترچھے ہیٹ اتار کر فولادی خود پہن لیے۔ یہ حصہ فرانس بھیجا گیا جہاں وہ آخر تک مسوم کے محاذ پر پوزیرس، ڈبل کورٹ اور پاشنڈیل کے خونیں معرکوں میں دادِ شجاعت دیتا رہا۔ چونکہ یہ لوگ حملے میں عین دھار پر ہوتے تھے لہذا تمام اتحادی فوجوں کی نسبت ان کو سخت جانی نقصان اٹھانا پڑا یعنی ان کے کشتوں کی تعداد ۶۸½ فی صد تھی۔

دوسری جنگِ عظیم میں آسٹریلیا نے پھر اتحادیوں کا ساتھ دیا۔ سوائے دو بھاری جنگی جہازوں کے اس کی تمام بحری فوج بحیرۂ روم میں برطانیہ کے بیڑے کے ساتھ شامل ہو گئی۔ فوج کے تین ڈویژن مشرقِ وسطیٰ بھیجے گئے۔ ساٹھ ہزار آسٹریلوی نوجوانوں کو سلطنتِ برطانیہ کے ہوائی فوج کے سکولوں میں بھیجنے کا انتظام کیا گیا تاکہ وہ تربیت حاصل کرنے کے بعد رائل ایر فورس کے ساتھ مل کر کام کریں۔ آسٹریلیا کی فوج کا چھٹا ڈویژن بھی جلد ہی شمالی افریقہ کے صحرا میں بھیج دیا گیا جہاں اس نے برطانیہ کی فوجوں کے ساتھ مل کر مسولینی کی سلطنت کو ختم کرنے میں بڑی کامیابی سے حصہ لیا۔ اسی طرح آسٹریلیا کا نواں ڈویژن یونان میں بھیجا گیا جہاں دوسری برطانوی افواج کے ساتھ اُسے بہت سخت شکست اٹھانی پڑی۔ نیوزی لینڈ کی فوج بھی اس وقت ان کے ساتھ شامل تھی۔ اس جگہ جرمن زرہ پوش فوج نے یوگوسلاویا کی طرف سے نہایت تیزی سے ان پر حملہ کر کے پسپا کر دیا۔ یونان سے نکالے جانے کے بعد انھوں نے کریٹ پر

بہت ڈٹ کر مقابلہ کیا، لیکن آخرکار انھیں مصر کی طرف ہٹنا پڑا۔ مصر میں جرمنی کی افریقہ کور نے برطانیہ کی ان تھکی ہوئی اور کمزور فوجوں پر حملہ کرنا شروع کیا اور انھیں مصر میں ڈھکیل دیا۔ اس وقت بحیرۂ روم میں صرف طبروق کے اردگرد کا علاقہ اتحادیوں کے پاس رہ گیا۔ اس جگہ آسٹریلیا کے نویں ڈویژن کا قبضہ تھا جو یہاں چھ مہینے سے زیادہ عرصے تک دشمن کے ساتھ سخت لڑائی میں مصروف رہے۔ طبروق پر کامیاب قبضہ ہونے کی وجہ ہی سے جرمنی کا جرنیل رومیل قاہرہ کی طرف نہ بڑھ سکا۔

جب اس طرح آسٹریلیا کی فوج کا زیادہ حصہ مشرقِ وسطیٰ میں جنگ میں مصروف تھا تو جاپان نے پرل ہاربر پر حملہ کردیا۔ اب بحرالکاہل میں بھی جنگ شروع ہوگئی۔ آسٹریلیا کی فوجیں یورپ کی لڑائیوں میں اس خیال سے حصہ لے رہی تھیں کہ سنگاپور کے مضبوط بحری قلعے کی وجہ سے جنگ ایشیا میں نہ پہنچ سکے گی اور دشمن اس راستے سے آسٹریلیا تک نہ آسکے گا۔ جب جاپانی فوجوں نے جزیرہ نمائے ملایا میں جنوب کی طرف بڑھتے ہوئے خشکی کے راستے اس "ناقابلِ تسخیر" قلعے کو فتح کرلیا تو آسٹریلیا کے لوگ نہایت خوف اور دہشت کی حالت میں نتیجے کا انتظار کرنے لگے۔ آسٹریلیا کا آٹھواں ڈویژن، جس نے سنگاپور کی مدافعت کی تھی، سب کا سب گرفتار ہوگیا اور اس کے سپاہی جاپانیوں کے قیدیوں کے کیمپوں میں بھیج دیے گئے۔

یہ حالت دیکھ کر آسٹریلیا نے اپنے ڈویژنوں کو مشرقِ وسطیٰ سے واپس آنے کا حکم دیا۔ لیکن یہ جنگ میں بہت بُری طرح سے پھنسے ہوئے تھے اور انھیں واپس لانے کے لیے کافی تعداد میں بحری جہاز موجود نہ تھے لہٰذا وہ اپنے وطن کی حفاظت کے لیے واپس نہ آسکتے تھے۔ خوش قسمتی سے صدر روزویلٹ نے جاپان پر جوابی حملہ کرنے کا فیصلہ کرلیا اور جاپانیوں کو روکنے کے لیے امریکی فوجیں سولومن اور نیوگنی پہنچ گئیں۔ بحر کورل کی لڑائی جس میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے ہوائی جہازوں نے آسٹریلیا کے اڈوں سے اڑ کر جاپانی بحری بیڑے کو سخت نقصان پہنچایا ایک قابلِ تعریف فوجی کارنامہ تھا۔ اس وقت ریاستہائے متحدہ

امریکا کی پانچویں ہوائی فوج نے نیوگنی کے جاپانی اڈوں پر نہایت کامیاب حملے شروع کیے اور آسٹریلیا کی فوج کا نواں ڈویژن جاپانی فوجوں کو اودن سٹینلے کے سلسلہ کوہ سے پیچھے ڈھکیلنے کے لیے ٹھیک وقت پر پہنچ گیا۔ اس کے بعد جنرل میکارتھر نے جزائر فلپائن کی طرف بڑھنا شروع کیا اور آسٹریلیا پر حملے کا خطرہ ٹل گیا۔

پہلی اور دوسری جنگِ عظیم میں آسٹریلیا کے سپاہیوں کو سمندر پار لڑنے کے لیے بھیجا گیا۔ دونوں مرتبہ آسٹریلیا کے لوگوں نے اسے سخت ناپسند کیا۔ ان کے خیال میں انھیں سمندر پار کی لڑائیوں میں حصہ لینے کے لیے مجبور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ آسٹریلیا کے تمام سپاہی اپنی خوشی سے فوج میں ملازمت اختیار کرتے تھے اور ہر قسم کی تکلیفوں کو برداشت کرنے کے لیے تیار تھے۔ وفاقی حکومت نے دو مرتبہ جبری بھرتی کا قانون نافذ کرانے کی کوشش کی، لیکن آسٹریلیا کے انفرادیت پسند لوگ اس قانون سے نفرت کرتے تھے اور وہ یہ بھی نہ چاہتے تھے کہ انھیں یورپ میں لڑنے کے لیے بھیجا جائے۔ دوسری جنگِ عظیم میں بھی لوگوں کی عام رائے جبری بھرتی کے خلاف تھی، لیکن حملے کے خطرے کی وجہ سے اس مرتبہ ملک کی اندرونی خدمات اور حفاظت کے لیے جبری بھرتی کا ایک قانون پاس ہو گیا۔ اس طرح ملک میں دو قسم کے فوجی سپاہی پیدا ہو گئے۔ ایک وہ جو ملک کے اندر رہ کر خدمات انجام دینے کے لیے جبراً بھرتی کیے گئے تھے اور دوسرے وہ جنھوں نے اپنی خوشی سے سمندر پار جاکر لڑنا قبول کیا تھا۔ اس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ ملکی فوج کی نسبت سمندر پار لڑنے والی فوج میں زیادہ اچھے اور ہوشیار افسر جانے لگے اور انھیں سامانِ جنگ بھی زیادہ بہتر قسم کا ملنے لگا۔ جب جاپانیوں نے حملہ کیا تو اس وقت آسٹریلیا کی حفاظت انھی کے سپرد کی گئی اور قومی فوج نیوگنی اور شمالی جزیروں میں لڑنے کے لیے بھیج دی گئی۔

دوسری جنگِ عظیم میں آسٹریلیا نے فوجی حکمتِ عملی کا ایک نہایت اہم سبق سیکھا۔ اگرچہ آسٹریلیا کی اپنی آزاد فوج اور بحریہ تھی لیکن اس وقت تک وہ اپنی حفاظت کے لیے زیادہ تر

برطانیہ کی حمایت پر بھروسا کرتا تھا۔ اب یہ بات صاف ظاہر ہو گئی کہ اسے زیادہ خطرہ قریب کے دشمنوں سے ہو سکتا ہے۔ مشرقِ بعید میں بہت سی یورپی بستیوں کے ختم ہو جانے سے اور ایشیائی قوموں کے ابھرنے کی وجہ سے اس نے یہ محسوس کر لیا کہ اس دُور دراز مقام پر انھیں اپنی حفاظت کا انتظام خود کرنا ہوگا۔ اس خیال کے مطابق آسٹریلیا سیاسی لحاظ سے ریاستہائے متحدہ امریکا کے زیادہ قریب ہو گیا ہے اور ان دونوں ملکوں اور نیوزی لینڈ کے درمیان باہمی امداد کا ایک عہدنامہ ہو چکا ہے۔ اب آسٹریلیا پر حملے کی صورت میں ریاست ہائے متحدہ امریکا فوراً اس کی مدد کو پہنچے گا۔

تیسواں باب

شہر اور ریاستیں

آسٹریلیا کی دولتِ مشترکہ میں چھ خود مختار ریاستیں، تین ایسے علاقے جن کا انتظام براہِ راست وفاقی حکومت کے ہاتھ میں ہے، بحرالکاہل کے دو جزیرے اور انٹارکٹکا کا زیردست علاقہ شامل ہیں۔ ان کے علاوہ اقوامِ متحدہ کی طرف سے دو اور علاقے بھی اس کے سپرد ہیں۔ ان ریاستوں اور علاقوں کا مختصر حال ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

وفاقی حکومت کے صدر مقام کا علاقہ۔ (رقبہ نو سو انتالیس مربع میل)

صدر مقام: کینبرا

وفاقی حکومت کے صدر مقام کا علاقہ، سڈنی سے ڈیڑھ سو میل دور جنوب مغرب میں واقع ہے۔ یہ جگہ ریاستہائے متحدہ امریکا کے کولمبیا کے ضلع سے بہت ملتی جلتی ہے۔ اس میں آسٹریلیا کی قومی حکومت کا صدر مقام شہر کینبرا واقع ہے۔ جب ۱۹۰۱ء میں وفاقی حکومت قائم کی گئی تو یہ سوال پیدا ہوا کہ اس کا صدر مقام کہاں ہو۔ اس کے لیے بہت سی عمدہ جگہیں تجویز کی گئیں۔ سڈنی اور میلبورن یہ چاہتے تھے کہ نیا وفاقی علاقہ ان کے قریب ہو۔ آخرکار دولتِ مشترکہ کو قائم کرنے والوں نے ان دونوں شہروں کے درمیان ایک نہایت عمدہ دیہاتی علاقہ اس غرض کے لیے چنا۔ نئے صدر مقام کا نقشہ تیار کرنے کا کام شکاگو کے ایک انجینیر والٹر برلے گریفن کے سپرد کیا گیا۔ اس کا نقشہ امریکا کے صدر مقام واشنگٹن کی طرز پر بنایا گیا لیکن واشنگٹن کی کھلی اور سیدھی سڑکیں پیرس کے نمونے پر بنائی گئی ہیں اور کینبرا کے کھلے راستے دائرے کی شکل میں واقع ہیں جن پر وہ بڑی سرکاری عمارتیں بازاروں سے کچھ دور

ایک بڑے میدان میں تعمیر کی گئی ہیں۔ دنیا کے بہت کم صدر مقام ایسی عمدہ جگہ پر واقع ہیں۔ اس شہر کے لیے اتنا وسیع رقبہ استعمال کیا گیا ہے کہ اس کے مختلف حصّے ایک دوسرے سے بالکل الگ تھلگ معلوم ہوتے ہیں۔

شہر کینبرا میں بہت سے اہم دفاتر اور ادارے واقع ہیں۔ دولتِ مشترکہ کی رصد گاہ، دفتر جنگلات، صنعتی و سائنسی تحقیق کی عمل گاہیں، صحتی اور طبّی تحقیقاتی کونسل، ادارۂ تشریح الاعضاء اور قومی یونیورسٹی وغیرہ یہیں ہیں۔ شاہی فوجی کالج اور شاہی بحریہ کالج بھی اس کے پاس ہی ہیں۔

ریاست نیو ساؤتھ ویلز - رقبہ تین لاکھ نو ہزار چار سو تینتیس مربع میل

صدر مقام : سڈنی

پرانے ولندیزی جہاز رانوں نے آسٹریلیا کے مشرقی ساحل کو نیو ہالینڈ کا نام دیا تھا، لیکن جو انگریز یہاں پہلے پہنچے انھوں نے اس نام کو پسند نہ کیا۔ کپتان کک نے خیال کیا کہ یہ علاقہ ساؤتھ ویلز کے ساحل سے بہت ملتا جلتا ہے، اس لیے اس نے اس نئی سرزمین کا نام نیو ساؤتھ ویلز رکھ دیا۔ اِس وقت سارے برّاعظم میں یہ سب سے زیادہ آباد ہے اور ملک کی بڑی بڑی صنعتیں بھی اسی حصّہ میں قائم ہیں۔

اس ریاست کا صدر مقام سڈنی آسٹریلیا کی سب سے بڑی بندرگاہ اور نہایت اہم صنعتی مرکز ہے۔ یہاں سمندر کافی گہرا ہے اور جہازوں کے کھڑے ہونے کے لیے بہت عمدہ گودیاں ہیں، جہاں دنیا کے تمام حصّوں سے آنے والے جہاز کھڑے ہوتے ہیں۔ یہ پورٹ جیکسن پر واقع ہے، جسے سڈنی ہاربر بھی کہتے ہیں۔ اس جگہ چھوٹی چھوٹی خلیجوں اور راسوں کے ساتھ ایک سو نوّے میل لمبا ساحل پھیلا ہوا ہے۔ بندرگاہ کے کناروں پر بہت سے عمدہ پارک اور عوام کے باغ ہیں۔ شہر اور اس کے نواحی علاقوں کے درمیان اکثر دُخانی جہازوں کے ذریعے سمندر میں سے آمد و رفت ہوتی ہے۔ جہاں سمندر تنگ ہے، وہاں دونوں

طرف کے علاقوں کو ملانے کے لیے نیویارک کے ہیل گیٹ کے پُل کی طرح ایک بہت بڑا فولادی پُل بنا ہوا ہے۔ سڈنی دورِ جدید کا نہایت بارونق شہر ہے اور اس کی عمارتیں فلاڈیلفیا کی عمارات سے بہت ملتی ہیں، جہاں بڑے بڑے سٹور، کاروباری دفتر، بنک اور گودام موجود ہیں۔ یہاں کچھ حصّے میں زمین دوز راستوں کا انتظام بھی ہے۔ آمد و رفت پر قابو پانے کے لیے اکثر سڑکوں پر یک طرفہ آمد و رفت کا قاعدہ ہے۔ کرایے کی موٹریں اور ٹیکسیاں بکثرت موجود ہیں۔ یہاں یونیورسٹی اور ایک ٹیکنیکل کالج بھی ہے۔ شہر کے جنوبی کنارے پر بہت سی فیکٹریاں ہیں جن میں تقریباً ہر قسم کی چیزیں تیار ہوتی ہیں۔

نیو ساؤتھ ویلز کے کھلے ساحل کے ساتھ ساتھ چھوٹی چھوٹی خلیجوں اور بلند چٹانوں کے نیچے بہت سے خوبصورت ریتلے ساحلی علاقے ہیں۔ شہر کے قریب کے ساحل بونڈی، گوگی اور منیلی نہانے کے مشہور تفریحی مقامات ہیں۔ سڈنی سے پچاس میل اندر کی طرف بلیو ماؤنٹین یا نیلے پہاڑ واقع ہیں جن کا یہ نام اس وجہ سے پڑ گیا ہے کہ ان کی چوٹیاں اکثر نیلے رنگ کی دھند میں چھپی رہتی ہیں۔ یہ پہاڑ سطح سمندر سے تین ہزار فٹ اونچے ہیں۔ درحقیقت یہ کوہِ فاصلِ اعظم کا جنوبی حصہ ہیں جو اور زیادہ جنوب میں موسم سرما میں برف سے ڈھک جاتے ہیں اور سڈنی کے لوگ یہاں برف پر تفریح اور کھیلوں کے لیے آتے ہیں۔

نیو ساؤتھ ویلز میں کئی اور اہم شہر بھی واقع ہیں۔ سڈنی سے ایک سو میل سے کچھ زیادہ فاصلے پر شمال میں نیوکیسل واقع ہے جو دریائے ہنٹر پر ایک بڑی بندرگاہ ہے اور یہاں نصف کرۂ جنوبی کا سب سے بڑا فولاد کا کارخانہ قائم ہے۔ نیوکیسل سے آگے خشکی کی طرف کوئلے کی کانوں کا بہت بڑا علاقہ ہے، جس کا مرکز لیتھگو ہے۔ سیسناک اور میٹ لینڈ بھی اس کے قریب ہی واقع ہیں۔ سڈنی کے ساٹھ میل جنوب میں کوئلے اور لوہے کا ایک اور علاقہ ہے جو پورٹ کیمبلا کے گرد واقع ہے اور ان کے علاوہ دُور مغرب میں ساؤتھ آسٹریلیا کی سرحد کے قریب چاندی اور سیسے کی کانوں کا شہر بروکن ہل آباد ہے۔

نیو ساؤتھ ویلز کی ریاست میں آسٹریلیا کے سب سے زیادہ اون پیدا کرنے والے اضلاع واقع ہیں۔ دریائے مرم بڈگی اور دریائے مرے کے درمیان ریورینا کا علاقہ ہے جو عمدہ اون اور گھوڑوں کے گلّوں کے لیے مشہور ہے۔ شمال میں کوہِ فاصلِ اعظم کے مشرق میں شمالی بلند علاقہ بھیڑوں کے وسیع باڑوں کے لیے مشہور ہے۔ ساحلی علاقے ڈیری فارموں کی صنعت کے لیے مشہور ہیں اور یہاں سے دودھ تیز رفتار گاڑیوں کے ذریعے سڈنی پہنچایا جاتا ہے۔

ریاست وکٹوریا۔ رقبہ ستاسی ہزار آٹھ سو چراسی مربع میل

صدر مقام: میلبورن۔

اس ریاست کا یہ نام ملکہ وکٹوریا کے نام پر رکھا گیا۔ یہ برِ اعظم آسٹریلیا کی سب سے چھوٹی ریاست ہے لیکن آبادی، پیداوار اور صنعت و حرفت کے لحاظ سے صرف نیو ساؤتھ ویلز سے دوسرے درجے پر ہے۔ دریائے مرے کے جنوب کا تمام علاقہ اس ریاست میں شامل ہے، جس میں سے صرف مغرب کا ایک تھوڑا سا ٹکڑا ساؤتھ آسٹریلیا میں داخل ہے۔ یہ آسٹریلیا کا سب سے زیادہ زرخیز حصّہ ہے اور یہاں دریاؤں سے پانی خوب حاصل ہوتا ہے۔ کوہِ فاصلِ اعظم وکٹوریا میں پہنچ کر ختم ہو جاتا ہے اور اس کی جنوبی ڈھلانوں پر گھنے جنگل ہیں۔ جہاں بہت اونچے یوکلپٹس کے درخت پائے جاتے ہیں۔ بہت سے چھوٹے چھوٹے لیکن نہایت عمدہ دریا بحرِ جنوبی میں بھی گرتے ہیں۔ اور ان میں سے پانچ بڑے دریا شمال مغرب کی طرف بہتے ہوئے دریائے مرے میں جا ملتے ہیں۔ وکٹوریا کا صوبہ اس طرح نہایت زرخیز فارموں کا ملک ہے۔ یہاں بھیڑیں، مویشی اور مرغیاں بکثرت پالی جاتی ہیں۔ گندم، پھل اور بہت سی قسموں کے اناج پیدا کیے جاتے ہیں۔ میلبورن کے مشرق کا علاقہ جسے مغربی ضلع کہتے ہیں اپنی عمدہ چراگاہوں کے لیے مشہور ہے اور یہاں بھیڑوں کے پالنے سے بڑا فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔

ریاست وکٹوریا میں بہت سی عمدہ سڑکیں ہیں، جن کے گرد و نواح کا نظارہ نہایت دلفریب ہے۔ ان پر بڑی آمد و رفت ہوتی ہے۔ پرنسز ہائی وے کی بڑی شاہراہ سڈنی سے مشرقی ساحل کے ساتھ ساتھ جنوب میں گھنے جنگلوں اور جھیلوں کے علاقے میں سے گزر کر وکٹوریا کے صوبے میں داخل ہوتی ہے۔ میلبورن کے جنوب مشرق میں بھی کئی اچھی سڑکیں ڈینڈے نونگ کے پہاڑوں کے اوپر سے دروں کے راستے آگے جاتی ہیں۔ یہاں گھنے جنگل پائے جاتے ہیں اور سردیوں میں ان پہاڑوں کی چوٹیاں برف سے ڈھکی رہتی ہیں، جس کی وجہ سے لوگ یہاں برفانی کھیلوں کے لیے آتے ہیں۔ ایک اور عمدہ سڑک ساحل کے ساتھ ساتھ مغرب کی طرف ساؤتھ آسٹریلیا کو بھی جاتی ہے۔

اس ریاست کا صدر مقام میلبورن جو پورٹ فلپ بے کے سرے پر واقع ہے، نہایت بارونق شہر اور تجارتی مرکز ہے۔ یہ شہر دریائے یارا پر تعمیر کیا گیا ہے۔ جس کے دہانے میں ایک بڑی بندرگاہ واقع ہے، جہاں جہازوں کے ٹھہرنے کے لیے بہت سے گھاٹ اور بند بنائے گئے ہیں۔ اس کا نقشہ انگیٹھی کی لوہے کی سلاخوں کی طرح بنایا گیا ہے۔ جس میں ہر بڑی سڑک کے بعد ایک چھوٹی سڑک یا گلی آتی ہے، چونکہ اس کا نقشہ کمال ہوشیاری سے بنایا گیا ہے اور بہت سا رقبہ باغوں کے لیے مخصوص ہے اس لیے یہ بڑا خوبصورت اور پُرسکون شہر معلوم ہوتا ہے۔ شہر کے وسط میں سے بہت سی سڑکیں اس کے نواحی علاقوں کو جاتی ہیں۔ اس شہر کے باغ ہائے درختاں جو دریائے یارا کے کنارے واقع ہیں، دنیا کے بہترین باغ سمجھے جاتے ہیں۔ یہاں ایک نہایت عمدہ تصویر خانہ ہے جس میں موجودہ زمانے کی نہایت اعلیٰ تصویریں جمع کی گئی ہیں۔ ان میں فرانسیسی طرز کی دونوں قسموں کی تصویروں کے نمونے موجود ہیں یعنی ایک تو وہ جن میں تصویر کے مجموعی اثر پر زور دیا جاتا ہے دوسری وہ قسم جن میں جزئیات کا زیادہ خیال رکھا جاتا ہے۔ ان میں وینڈائیک اور رابرن کے کچھ نہایت بلند پایہ شاہکار بھی شامل ہیں۔ بہت سے نہایت عمدہ پرائیویٹ اور پبلک سکول

موجود ہیں۔ ایک بڑی یونیورسٹی اور میڈیکل سکول بھی ہے۔

پورٹ فلپ بے پر ایک اور بندرگاہ گی لونگ بھی واقع ہے جو اس صوبے میں دوسرے درجے کی بندرگاہ ہے اور مغربی اضلاع کی تمام پیداوار یہیں سے برآمد ہوتی ہے۔ میلبورن اور گی لونگ کے درمیانی علاقے میں بہت بڑے صنعتی کارخانے قائم ہو رہے ہیں، جن میں سے سب سے بڑا فورڈ کمپنی کا کارخانہ ہے۔ بلارٹ اور بنڈی گو کے پرانے شہر جو سونے کی کانوں کی وجہ سے آباد ہوئے، اب اس صوبے کے بڑے بارونق مضافاتی شہر بن گئے ہیں، جہاں صنعت و حرفت میں بھی ترقی ہو رہی ہے۔

ریاست کوئینز لینڈ - رقبہ چھ لاکھ ستر ہزار پانچ سو مربع میل

صدر مقام : برسبین

اس ریاست کا نام بھی ملکہ وکٹوریا کے نام پر رکھا گیا۔ اور یہ اس ملک میں چرواہوں کی سب سے بڑی ریاست ہے۔ اس کے جنوب میں ڈارلنگ ڈاؤنز کا زرخیز علاقہ ہے، جہاں سے دریائے ڈارلنگ نکلتا ہے۔ یہاں گیہوں کے بہت وسیع فارم اور بھیڑوں کے مرکز ہیں۔ اس علاقے کا سب سے بڑا شہر ٹوومبا سطح سمندر سے دو ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ شمال میں بلند سطح مرتفع پر ایتھرٹن کا علاقہ ہے جہاں مویشیوں کے بڑے بڑے مرکز ہیں۔ کوہِ فاصلِ اعظم کے دامن میں ساحل کے ساتھ ساتھ گنّا، مونگ پھلی اور منطقہ حارہ کے پھلوں کی بڑی کاشت ہوتی ہے۔ چونکہ کوئینز لینڈ کی آب و ہوا قدرے گرم اور مرطوب ہے، اس لیے اس کے ساحلی علاقوں میں نباتات کی کثرت ہے۔ زیادہ شمالی حصے میں منطقۂ حارہ کے تناور درختوں کے جنگل ہیں جن پر طرح طرح کی بیلیں لپٹی رہتی ہیں۔ ان گھنے جنگلوں میں ہر قسم کے پودے اُگتے ہیں اور زیرِ درختی بھی خوب ہوتی ہے۔

برسبین صدر مقام ہے جو اس وسیع ریاست کے جنوب مشرقی کونے میں واقع ہے۔ یہ شہر برسبین پر تعمیر کیا گیا ہے جو یہاں مورٹن بے میں گرتا ہے۔ یہ اس علاقے کی بڑی بندرگاہ

بھی ہے۔ یہ شہر مختلف اقسام کے پھولدار درختوں اور پودوں کے لیے مشہور ہے۔ اس میں بہت سی عمدہ عمارتیں ہیں، لیکن اس کے نواحی حصّوں کے اکثر مکانات کیڑے مکوڑوں سے بچنے کے لیے سطح زمین سے قدرے بلند لکڑی کے ستونوں پر بنائے گئے ہیں۔ ساحل کے ساتھ ساتھ بہت سے تفریحی مقامات پائے جاتے ہیں اور مورٹن بے میں اکثر لوگ کشتی کی سیر اور کھیلوں کے لیے آتے ہیں۔

کوئینز لینڈ کے اکثر شہر ساحل کے ساتھ ساتھ واقع ہیں۔ برسبین کے شمال میں میری بورو، راک ہمپٹن، میکے اور ٹاؤنز واٹل ایک کے بعد ایک سب ساحل پر واقع ہیں۔ برسبین سے ایک ہزار میل آگے شمال میں کیرنز کا خوبصورت شہر ہے۔ جہاں اکثر سیاح اس کی جھیلوں، گھنے جنگلوں اور پھلوں کے باغ دیکھنے کے لیے جاتے ہیں۔ مونگے کی بڑی دیوار کے کچھ چھوٹے چھوٹے مونگے کے جزیرے یہاں سے قریب ہی ہیں اور اس جگہ سے انھیں دیکھنے کے لیے جا سکتے ہیں۔ ان میں بعض نہایت خوبصورت جزیرے شامل ہیں۔ ڈے ڈریم آئی لینڈ اور میگنیٹک آئی لینڈ نہایت دلفریب تفریح گاہیں ہیں۔

کیرن کے شمال میں کیپ یارک کا جزیرہ نما ہے۔ یہ وسیع علاقہ نہایت بنجر اور بہت کم ترقی یافتہ ہے۔ اس کا کچھ حصّہ نیوگنی (ایریان) کے بہت قریب چلا گیا ہے۔ اس جزیرہ نما کے مغرب میں کارپینٹریا کی خلیج واقع ہے۔ اس وسیع خلیج میں موتیوں کا شکار کیا جاتا ہے۔ اس صنعت کا مرکز تھرس ڈے آئی لینڈ میں ہے جو اس جزیرہ نما کے آخری سرے کے قریب واقع ہے۔

ریاست ساؤتھ آسٹریلیا۔ رقبہ تین لاکھ اسی ہزار ستر مربع میل

صدر مقام : ایڈی لیڈ

یہ ریاست برّاعظم کا بہت سا جنوبی وسطی حصّہ گھیرے ہوئے ہے۔ اس کو ایک مثالی نوآبادی بنانے کا منصوبہ تیار کیا گیا تھا۔ جو لوگ یہاں آباد ہونا چاہتے تھے، انھوں

نے لندن میں ایک ساؤتھ آسٹریلین کمپنی قائم کی۔ وہ جس قدر زمین یہاں حاصل کرنا چاہتے، اس کے مطابق کمپنی کو رقم ادا کر دیتے۔ ان کا پہلا بحری بیڑا ۱۸۳۷ء میں یہاں پہنچا۔ پہلے وہ اس بڑے جزیرے پر اترے، جسے کنگرو آئی لینڈ کہتے ہیں۔ چونکہ یہاں کنگرو بہت زیادہ تعداد میں پائے جاتے تھے، اس لیے انھوں نے اس کو یہ نام دیا۔ یہاں سے وہ برِاعظم پہ ایک ریتلے ساحل پہ پہنچے اور جس جگہ اس وقت شہر ایڈی لیڈ واقع ہے، اسی جگہ انھوں نے اپنی ایک چھوٹی سی بستی بسائی۔ آسٹریلیا میں یہی ایک ایسی ریاست ہے جس کی حدود میں مجرموں کو لاکر آباد نہیں کیا گیا۔

ایک نہایت عمدہ شہر کا نقشہ تیار کرنے کے لیے ایک انجینئر کی خدمات حاصل کی گئیں جس نے ایڈی لیڈ کا شہر تعمیر کرایا۔ شہر کا یہ نام اس وقت کی برطانوی شہزادی کے نام پر رکھا گیا۔ کرنل ولیم لائٹ نے سب سے پہلے ایک مربع میل جگہ منتخب کی، جس کے وسط میں اور چاروں کونوں پر مربع عمارتوں کا دلکش سلسلہ قائم کرکے شہر کا نقشہ بنایا۔ اس ایک مربع میل شہر کے چاروں طرف اس نے دو فرلانگ چوڑی جگہ پارکوں کے لیے چھوڑ دی۔ اس سے آگے اردگرد کی پہاڑیوں تک نواحی علاقوں کا ایک ڈھانچا تیار کیا۔ جس میں تمام سڑکیں انگیٹھی کی سلاخوں کی طرح بنائی گئیں۔ سارے شہر کو اسی نقشے کے مطابق تعمیر کیا گیا اور بعد میں پارکوں اور باغوں کی طرف خاص توجہ کی گئی جس سے یہ شہر نہایت خوبصورت بن گیا۔ جو لوگ یہاں آتے ہیں وہ اس کے خوبصورت کھلے میدانوں کو دیکھ کر بڑے متاثر ہوتے ہیں، جن میں سجاوٹ کے لیے نہایت عمدہ درخت اور بہت سے مجسمے موجود ہیں۔ اس جگہ بہت سے کھیلوں کے میدان اور فلاحتی باغ (بوٹینیکل گارڈنز) بھی ہیں۔ دریائے ٹورنز جو اس شہر کے وسط سے گزرتا ہے اس کی خوبصورتی کو دوبالا کرتا ہے۔ یہ موجودہ زمانے کا تجارتی شہر ہے، لیکن یہاں سڈنی اور میلبورن کی طرح زیادہ رونق نہیں۔ اس جگہ صنعت و حرفت کے بہت سے کارخانے بھی ہیں اور شہر کے

مغربی حصّے میں جنرل موٹرز اور ہولڈن برادرز کا موٹروں کا کارخانہ ہے۔ آسٹریلیا کی اکثر موٹریں اسی جگہ تیار ہوتی ہیں۔ یہاں ایک عمدہ یونیورسٹی' طبی کالج اور صنعتی کالج بھی ہیں۔

ساؤتھ آسٹریلیا کا تقریباً دو تہائی حصّہ بنجر اور خشک ہے لیکن اس کے باقی حصّے میں خوب کاشتکاری ہوتی ہے اور بہت سے پھلوں کے باغ ہیں۔ اون حاصل کرنے کے لیے بھیڑیں نیز مویشی بڑی کثرت سے پالے جاتے ہیں۔ یہاں آبپاشی کی طرف خاص توجہ دی گئی ہے۔ دریائے مرے اس ریاست کے جنوب مشرقی کونے میں سمندر میں گرتا ہے اور یہاں کی خشک زمین کو آبپاشی کے قابل بنانے کے لیے' اس دریا کے پانی سے بڑا فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ کان کنی بھی اس ریاست کی بڑی صنعتوں میں سے ایک ہے۔ اور خلیج اسپنسر کے سرے پر پورٹ پیری میں چاندی اور سیسے کو صاف کرنے کے بہت سے کارخانے ہیں۔ اس خلیج کے دوسرے کنارے پر وہیالا میں لوہا بھی نکلتا ہے اور یہاں بحری جہاز بنانے کے کارخانے ہیں۔ مونٹا کے مقام پر تانبا نکلتا ہے۔ والا رو میں فاسفیٹ کا ایک بڑا کارخانہ ہے۔

ریاست ویسٹرن آسٹریلیا۔ رقبہ نو لاکھ چھتر ہزار نو سو بیس مربع میل
صدر مقام : پرتھ

ویسٹرن آسٹریلیا جو سارے برِ اعظم کے تقریباً ایک تہائی حصّے میں پھیلا ہوا ہے، آسٹریلیا کا سب سے کم ترقی یافتہ علاقہ ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ جنوب مغربی کونے کے سوا' یہ تمام ریاست ایک نیم ریگستان ہے۔ ایڈی لیڈ سے اس ریاست کے صدر مقام تک ایک ریلوے لائن جاتی ہے جس پر ایک ہزار میل تک کوئی درخت دکھائی نہیں دیتا۔ اس کے ایک حصّے میں ریلوے لائن کہیں مُڑے بغیر تین سو میل تک سیدھی چلی گئی ہے۔ ریاست کا جنوب مغربی کونا نہایت زرخیز علاقہ ہے۔ جہاں خوب کاشتکاری ہوتی ہے اور گھنے جنگل ہیں۔ ان جنگلوں سے مضبوط لکڑی حاصل ہوتی ہے جو بہت سی صنعتوں میں کام آتی

ہے ۔ برِاعظم کے انتہائی جنوبی کونے پر البینی کی خوبصورت قدرتی بندرگاہ واقع ہے، جہاں مختلف ممالک کو جانے والے تمام جہاز ٹھہرتے ہیں ۔ مغربی ساحلی علاقے کے وسطی حصے میں چند عمدہ دریا بہتے ہیں اور یہاں گندم کی کاشت ہوتی ہے اور اون کے لیے بھیڑیں پالی جاتی ہیں ۔ زیادہ شمالی حصے میں مویشیوں کے بہت سے وسیع اور کھلے احاطے ہیں ۔ یہاں ونڈھم کے مقام پر ڈبوں میں گوشت بند کرنے کا ایک بہت بڑا کارخانہ ہے ۔

ویسٹرن آسٹریلیا کا صدر مقام "پرتھ" دریائے سوان پر واقع ہے ۔ اس دریا کے دہانے پر فری مینٹل کی بندرگاہ ہے اور پرتھ اس سے بارہ میل دریا کے اوپر واقع ہے ۔ یہ ایک چھوٹا لیکن نہایت صاف ستھرا شہر ہے، جس کے اکثر بارونق بازار اور عمارتیں جدید طرز کی ہیں ۔ یہاں ایک عمدہ یونیورسٹی ہے ۔ شہر کے قریب ہی کنگز پارک ہے جس کے لیے ایک ہزار ایکڑ زمین قدرتی حالت میں رکھی گئی ہے ۔ تھوڑے فاصلے پر ڈارلنگ کے پہاڑ ہیں، جن پر کھیتی اور پارک اور تفریح کے مخصوص علاقے ہیں ۔

ویسٹرن آسٹریلیا کی سب سے اہم صنعت کان کنی ہے ۔ اس کی سونے کی کانیں پرتھ سے تقریباً پونے چار سو میل مشرق میں کالی گورلی اور بولڈرسٹی میں واقع ہیں ۔ کالی گورلی ایک خاص نمونے کا کانوں کا مثالی شہر ہے، جہاں دور تک سونا صاف کرنے کے کارخانوں کی چمنیاں دکھائی دیتی ہیں ۔ یہاں "گولڈن مائل" (سونے کا مربع میل) کے علاقے میں سے بھی کافی سونا حاصل ہو رہا ہے ۔ یہ شہر ایک صحرا کے عین وسط میں واقع ہے اور یہاں پرتھ سے نلوں کے ذریعے پانی پہنچایا جاتا ہے لیکن اس کے باوجود کالی گورلی میں عمدہ پارک اور خوبصورت باغ موجود ہیں ۔

ریاست تسمانیا ۔ رقبہ چھبیس ہزار دو سو پندرہ مربع میل

صدر مقام : ہوبارٹ

یہ جزیرہ عرصے تک جزائر شرق الہند کے ایک ولندیزی گورنر کے نام پر وین ڈیمنز لینڈ

کہلاتا تھا۔ اس کا موجودہ نام تسمانیا ایبل جان تسمان کے نام پر رکھا گیا جس نے اسے ۱۶۴۲ء میں دریافت کیا تھا۔ اس جگہ ۱۸۰۳ء میں ایک برطانوی نوآبادی قائم ہوئی اور اس کے بعد یہ مجرموں کی ایک بدنام نوآبادی خیال کیا جاتا تھا۔ یہ مثلث شکل کا جزیرہ ہے، جس میں سطحِ سمندر سے چار ہزار فٹ تک اونچے پہاڑ ہیں۔ دریائی وادیوں کے سوا اس کی اکثر سطح ناہموار ہے۔ چونکہ اس جزیرے میں سے بھاگ نکلنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا اس لیے برطانیہ کی حکومت نے اسے قیدیوں کی بستی کے لیے نہایت موزوں سمجھا۔ اس کے جنوب میں ایک تنگ خلیج پر پورٹ آرتھر میں، اس وقت بھی قیدیوں کی پرانی بستی کے کھنڈر موجود ہیں۔ تسمانیا کے قریب کے سمندر میں وھیل مچھلی کا شکار خوب ہوتا تھا۔ اور امریکا کے وھیل مچھلی پکڑنے والے جہاز اکثر اس جزیرے کی بندرگاہوں میں آیا کرتے تھے۔ اِس وقت پھل پیدا کرنا اور کاشتکاری یہاں کی بڑی صنعتیں ہیں۔ آسٹریلیا کی تمام ریاستوں میں سے تسمانیا ہی ایک ایسی ریاست ہے، جہاں دیہاتی آبادی شہری آبادی کی نسبت زیادہ ہے۔

اس کا صدر مقام جزیرے کے مشرقی ساحل اور دریائے ڈرونیٹ کے دہانے پر واقع ہے۔ یہ ایک نہایت عمدہ قدرتی بندرگاہ اور آسٹریلیا کا دوسرا پرانا شہر ہے۔ یہاں بہت سی عمارتیں ایسی ہیں جو آج سے سو سال پہلے تعمیر ہوئیں۔ اپنے پُرسکون ماحول کی وجہ سے یہ انگلستان کا ایک چھوٹا سا شہر معلوم ہوتا ہے۔ شہر کے پیچھے ماؤنٹ ولنگٹن واقع ہے جو موسمِ سرما میں برف سے ڈھک جاتا ہے۔ اس کے بلند علاقوں میں پانچ سو مربع میل کا ایک مخصوص رقبہ ہے جس میں بلند چوٹیاں، برفانی جھیلیں، آبشار، جنگل اور غار پائے جاتے ہیں۔ موسمِ گرما میں گرم میدانی علاقے سے بہت سے لوگ یہاں تفریح کے لیے آتے ہیں۔ تسمانیا کی ندیوں میں ٹراؤٹ (چال) مچھلی بکثرت پائی جاتی ہے۔

شمالی علاقہ (ناردرن ٹیری ٹری) رقبہ پانچ لاکھ تئیس ہزار چھ سو بیس مربع میل

صدر مقام: ڈارون

ناردرن ٹیری ٹری کو ریاست کا درجہ صرف اس لیے نہ مل سکا کہ یہاں آبادی بہت ہی کم ہے۔ اس وسیع رقبے کی آبادی جو ساؤتھ آسٹریلیا کے عین شمال میں واقع ہے، صرف اُنیس ہزار ہے۔ ان میں یہاں کے اصلی باشندے شامل نہیں، جن کی تعداد چودہ ہزار کے قریب ہوگی۔ اس علاقے کے لیے صرف ٹیری ٹری (علاقہ) کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ ۱۹۱۱ء تک یہ ساؤتھ آسٹریلیا کا ایک حصہ تھا، لیکن چونکہ اس وسیع علاقے کا انتظام جنوبی ریاست کے لیے مشکل تھا، اس لیے دولتِ مشترکہ کی حکومت نے اسے براہ راست اپنی نگرانی میں لے لیا۔ اس علاقے کا ناظمِ اعلیٰ جو "ایڈمنسٹریٹر" کہلاتا ہے، یہاں کی بڑی بندرگاہ ڈارون میں رہتا ہے۔ ایک اور ڈسٹرکٹ آفیسر ایلس سپرنگز میں قیام کرتا ہے جو برِ اعظم کے عین وسط میں واقع ہے۔ اس قصبے کی آبادی صرف تین ہزار ہے۔ وفاقی پارلیمان میں ناردرن ٹیری ٹری کا صرف ایک رکن ہوتا ہے، لیکن سات ارکان پر مشتمل ایک مجلسِ قانون ساز بھی ہے۔

پانی کے نہ ہونے سے یہاں کا بیشتر علاقہ بیکار ہے اور کاشتکاری یا بھیڑوں کے پالنے کا کام بھی نہیں ہوسکتا لیکن شمالی ساحل کے ساتھ ساتھ تھوڑا سا ایسا علاقہ ہے، جہاں ہر سال مون سون ہواؤں کی وجہ سے کچھ بارش ہو جاتی ہے۔ اس جگہ ڈھائی لاکھ مربع میل کے قریب زمین، بھیڑیں پالنے والوں کو ٹھیکے پر دی گئی ہے۔ اس علاقے میں تقریباً دس لاکھ مویشی، تینتیس ہزار گھوڑے اور چھبیس ہزار بھیڑیں ہوں گی۔ اس جگہ مویشیوں کے احاطے بہت ہی بڑے ہیں۔ ان میں سے سب سے بڑا احاطہ الگزنڈریا ڈاؤنز کہلاتا ہے گیارہ ہزار دو سو باسٹھ مربع میل رقبے میں ہے۔ وکٹوریا ریور ڈاؤنز کا احاطہ رقبے میں چھ ہزار نو سو چودہ مربع میل ہے۔ یہاں سونا، ابرک، رانگے، چاندی اور سیسے کی کانیں بھی پائی جاتی ہیں اور حال ہی میں یورینیم کی کچی دھات کے دریافت ہونے سے اس کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہوگئی ہے۔

انگلستان اور ایشیا کے اکثر ملکوں سے آسٹریلیا آنے والے تمام ہوائی جہاز سب سے

پہلے ڈارون کے ہوائی اڈے پر اترتے ہیں۔ لندن، قاہرہ، کراچی اور سنگاپور کے شہروں سے ڈارون تک باقاعدہ ہوائی جہاز جاتے اور آتے ہیں۔ انڈونیشیا کی بندرگاہوں سے مغربی آسٹریلیا کی طرف آنے والے بحری جہازوں کے لیے بھی یہ آخری بندرگاہ ہے۔ دوسری جنگِ عظیم میں جاپانی بمباری کی وجہ سے یہ شہر بالکل تباہ ہو گیا تھا۔

پاپوا کا علاقہ - رقبہ نوّے ہزار مربع میل

بڑا شہر: پورٹ مورسبے

یہ علاقہ پہلے برٹش نیوگنی کہلاتا تھا۔ اس علاقے میں جزیرۂ نیوگنی کے جنوب مشرقی حصّے کے علاوہ ٹریاؤ بریانڈ، وڈلارک، ڈی اینٹرے کاسٹو اور لوئس ڈیل کے جزیرے بھی شامل ہیں۔ یہاں کے اصلی باشندوں کا تعلق زیادہ تر میلانیشن نسل سے ہے۔ اور ان کی تعداد تقریباً تین لاکھ ہے۔ باہر سے آکر آباد ہونے والوں کی تعداد چار ہزار سے بھی کم ہے۔ یہ علاقہ ۱۸۸۴ء میں آسٹریلیا کے قبضے میں آیا۔ اس وقت جرمنی، اس کے شمالی حصّے پر قبضہ کر چکا تھا اور اس طرف آگے بڑھنے کی کوشش میں تھا۔ جب کوئنز لینڈ کی ریاست نے ایک فوج ان سے پہلے وہاں بھیج کر اس علاقے پر قبضہ کر لیا۔

ایک بلند سلسلۂ کوہ، جس کی بعض چوٹیاں سمندر کی سطح سے تیرہ ہزار فٹ سے بھی زیادہ اونچی ہیں اس تمام بڑے جزیرے میں مشرق سے مغرب تک چلا گیا ہے۔ لیکن اس کے ساحلی علاقے زیادہ تر دلدلی ہیں اور یہاں گھنے جنگل پائے جاتے ہیں۔ اس علاقے کا سب سے اہم دریا فلائی ہے، جس میں دہانے سے ایک سو بیس میل اوپر تک جہاز رانی ہو سکتی ہے۔ اس ملک کا تقریباً نصف حصّہ ابھی دریافت کرنا باقی ہے۔ یہاں معدنیات بھی بکثرت ہیں۔ اس کے پہاڑوں کی وادیوں میں سے اس وقت تک ایک کروڑ ڈالر کی مالیت کا سونا حاصل کیا جا چکا ہے۔ اس کے علاوہ یہاں تانبا، رانگا، سیسہ، جست، شنگرف اور پلاٹینم نیز پٹرول بھی پایا جاتا ہے۔ آسٹریلیا کے لوگ امید کرتے ہیں کہ پٹرول جس کی ان کے ملک میں کمی ہے

یہاں کافی مقدار میں حاصل ہوگا۔

یہاں ربڑ، ناریل اور قہوے کے درخت اگائے جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ یہاں کی زرخیز زمین میں گرم ممالک کی ہر قسم کی فصلیں پیدا ہو سکتی ہیں۔ اس علاقے کا انتظام ایک ناظمِ اعلیٰ کے ہاتھ میں ہے جسے دولتِ مشترکہ کی حکومت مقرر کرتی ہے اور جس کا صدر مقام رے باؤل ہے۔ اس ملک کی نگرانی بڑی سختی سے کی جاتی ہے اور چونکہ اکثر محنت کا کام یہاں کے اصلی باشندے کرتے ہیں، اس لیے بڑا خیال رکھا جاتا ہے کہ کوئی ان کے ساتھ سختی کا برتاؤ نہ کرنے پائے۔ جو شخص بھی کان کنی کے خیال سے یا آباد ہونے کے ارادے سے یہاں آتا ہے، اسے پہلے حکومت کو اپنی نیک نیتی اور مالی حالت کے متعلق یقین دلانا پڑتا ہے۔ ملک میں تعلیم پھیلانے کے لیے بہت سے سکول کھولے گئے ہیں اور ایک بڑا تعلیمی منصوبہ بنایا گیا ہے۔

جزیرے۔

بحرالکاہل کے دو جزیرے آسٹریلوی دولتِ مشترکہ میں شامل ہیں۔

جزیرۂ لارڈ ہوو۔ یہ چھوٹا سا جزیرہ سڈنی کے شمال مشرق میں، چار سو چھتیس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہاں صرف تین سو ایکڑ زمین ایسی ہے، جہاں کاشتکاری ہو سکتی ہے۔ یہ ۱۷۸۸ء میں دریافت ہوا اور انتظام کے لیے نیو ساؤتھ ویلز کی ریاست کے ساتھ شامل کر دیا گیا۔ یہاں صرف ایک سو پینسٹھ اشخاص رہتے ہیں۔

جزیرۂ نارفوک۔ یہ بھی سڈنی کے شمال مشرق میں ہے لیکن نو سو تیس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس کا رقبہ ساڑھے آٹھ ہزار ایکڑ اور آبادی ایک ہزار کے قریب ہے۔ اسے کپتان کک نے دریافت کیا اور شروع میں اس کو صرف مجرموں کی بستی کے طور پر استعمال کیا گیا۔ یہ جزیرہ دولتِ مشترکہ کی حکومت کے ماتحت ہے اور اس کا انتظام ایک ناظمِ اعلیٰ اور آٹھ چنے ہوئے ارکان کی مجلسِ مشاورت کے سپرد ہے۔ یہاں کے رہنے والوں کو کوئی ٹیکس ادا نہیں کرنا پڑتا، لیکن ہر مرد کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ ہر سال دس ڈالر بطور خراج سرکاری

خزانے میں جمع کرائے یا اس کے عوض میں کچھ دن جزیرے کی سڑکوں اور پارکوں میں کام کرے۔ اس جزیرے کی آب و ہوا گرم لیکن معتدل ہے اور بہت سے فارغ شدہ کاروباری لوگ یہاں آکر آباد ہو گئے ہیں۔

انٹارکٹک کا ماتحت علاقہ۔ رقبہ چوبیس لاکھ بہتر ہزار مربع میل۔

۱۹۳۳ء کے ایک بین الاقوامی معاہدے کے مطابق برّ اعظم انٹارکٹک کا تقریباً نصف حصّہ جو قطب جنوبی کے گرد واقع ہے، آسٹریلیا کے سپرد کر دیا گیا۔ فرانس کے علاقے ایڈمی لی لینڈ کو چھوڑ کر عرض البلد ۶۰° جنوبی سے جنوب کے تمام جزیرے اور اس برّ اعظم کا سارا علاقہ جو ۱۶۰° اور ۴۵° طول البلد مشرقی کے درمیان واقع ہے، اس میں شامل ہیں۔

آسٹریلیا کے لوگوں کو ہمیشہ سے اس وسیع مگر نامعلوم برّ اعظم سے جو اُن کے جنوب میں واقع ہے، بڑی گہری دلچسپی رہی ہے۔ آسٹریلیا کی کئی مہمیں سر ڈوگلس ماسن، سر ڈیوڈ اورم میسن، سر ٹی۔ ڈبلیو۔ ایج ورتھ ڈیوڈ، کپتان جے، کے ڈیوس اور سر ہیو برٹ ولکنز کے ماتحت یہاں جاتی رہی ہیں۔ اور ان کی کوشش سے، اس کے بہت سے ساحل اور کافی اندرونی حصّے کا نقشہ تیار کیا جا چکا ہے۔ اس وقت موسم کے مشاہدے کے لیے اور سائنسی تحقیق کے لیے آسٹریلیا کے دو مستقل اڈّے موجود ہیں۔ اس برّ اعظم کے اوپر برف کی ایک دبیز تہ موجود ہے جس کی گہرائی بعض جگہ ساڑھے آٹھ ہزار فٹ تک ہے۔ قطب جنوبی سمندر کی سطح سے دس ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ بلند پہاڑی سلسلے بھی موجود ہیں، جن میں سے اکثر برف کے نیچے چھپے ہوئے ہیں۔ اور صرف کسی کسی جگہ ننگی چٹانیں باہر دکھائی دیتی ہیں۔ اب تک اس برّ اعظم کا تفصیلی ارضیاتی جائزہ نہیں لیا جا سکا ہے، لیکن خیال کیا جاتا ہے کہ یہاں کوئلا اور عام معدنی دھاتیں موجود ہیں۔ اس وقت ایک مہم یہاں یورینیم کی تلاش میں جانے کی تیاری کر رہی ہے۔

سر دست برّ اعظم انٹارکٹک کی ایک ہی صنعت مشہور ہے یعنی وھیل مچھلی کا شکار۔

بحرِ جنوبی میں جو آسٹریلیا اور انٹارکٹکا کے درمیان واقع ہے، دنیا بھر میں سب سے زیادہ وھیل مچھلیاں پائی جاتی ہیں۔

ایریان، جو اقوامِ متحدہ کی نگرانی میں ہے۔

رقبہ - ترانوے ہزار مربع میل

جزیرہ ایریان کے شمالی حصّے پر جرمنی کا دعویٰ تھا، لیکن جب پہلی جنگِ عظیم شروع ہوئی تو انھوں نے اس پر ابھی پوری طرح قبضہ نہ کیا تھا کہ آسٹریلیا کی ایک فوج نے اس علاقے پر قبضہ کر لیا۔ اور جنگ کے ختم ہونے پر "لیگ آف نیشنز" کی طرف سے یہ علاقہ انھی کے سپرد کر دیا گیا۔ دوسری جنگِ عظیم میں اس پر جاپانیوں نے قبضہ کر لیا لیکن آسٹریلیا اور ریاست ہائے متحدہ امریکا کی فوجوں نے دوبارہ اسے ان سے چھین لیا۔ دسمبر ۱۹۴۶ء میں مجلسِ اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی نے اسے آسٹریلیا کی حکومت کے سپرد کر دیا۔ جزائر بسمارک اور سولومون گروپ کے شمالی جزیرے بھی اس کے ساتھ ہی شامل ہیں۔

یہ خشکی کا بڑا قطعہ اور سب جزیرے پہاڑی ہیں جن میں سے ان کی بعض چوٹیاں سمندر کی سطح سے پندرہ ہزار فٹ تک بلند ہیں۔ تمام علاقہ گھنے جنگلوں سے ڈھکا ہوا ہے اور ساحلی حصّوں میں دلدلیں ہیں۔ سب سے بڑا دریا سیپک ہے، جس میں تین سو میل تک جہاز رانی ہو سکتی ہے۔ ناریل کے درخت اگانا اس علاقے کی سب سے بڑی صنعت ہے، لیکن ربڑ، قہوہ اور روئی کی کاشت بھی بڑھ رہی ہے۔ معدنیات میں سے صرف سونا نکالا جاتا ہے اور ضلع مورولی کی کانوں سے اس وقت تک پانچ کروڑ ڈالر کا سونا حاصل ہو چکا ہے۔ یہاں کے باشندے زیادہ تر میلانیشین نسل کے ہیں، جن کی تعداد سات کروڑ کے لگ بھگ ہے۔ ان کے علاوہ چار ہزار یورپی اور دو ہزار چینی بھی یہاں رہتے ہیں۔

اس علاقے کے انتظام کے لیے دولتِ مشترکہ کی حکومت کی طرف سے ایک ناظمِ اعلیٰ مقرر

ہے جو یہاں بڑی کڑی نگرانی رکھتا ہے۔ یہاں کے باشندوں سے صرف خاص شرائط کے تحت ہی کام لیا جا سکتا ہے اور سفید نسل کا کوئی شخص اس علاقے میں داخل نہیں ہو سکتا جب تک اس کے پاسپورٹ پر اس مقصد کے لیے ویزا موجود نہ ہو۔

نورو — رقبہ پانچ ہزار دو سو ساٹھ ایکڑ

اندازہ لگایا گیا ہے کہ بحرالکاہل کے اس جزیرے میں پانچ کروڑ ٹن فاسفیٹس موجود ہے۔ پہلی جنگِ عظیم میں یہ جرمنی سے چھین لیا گیا تھا اور اس پر آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور برطانیہ تینوں کی مشترکہ حکومت تھی۔ دوسری جنگِ عظیم میں اس پر بھی جاپانیوں نے قبضہ کر لیا، لیکن بعد میں یہ ان سے لے لیا گیا۔ اب یہ مجلس اقوام متحدہ کی طرف سے آسٹریلیا کی دولتِ مشترکہ کی حکومت کے سپرد ہے جو اس کے دوسرے دو حصہ داروں کی طرف سے اس پر حکومت کرتی ہے۔ یہاں سے کثیر مقدار میں فاسفیٹ آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے کسانوں کو حاصل ہوتا ہے۔

چوبیسواں باب

آسٹریلیا کا مستقبل

اس وقت آسٹریلیا میں نوّے لاکھ انسان بستے ہیں۔ اس بڑے ملک کے لیے یہ آبادی بہت ہی کم ہے۔ خاص طور پر جبکہ اس کی کچھ ذمّہ داریاں ملک سے باہر بھی موجود ہیں۔ آسٹریلیا کے لوگوں کو اس بات کا بڑا احساس ہے۔ پچھلے پچاس سال میں ان کی آبادی دُگنی ہو گئی ہے، لیکن وہ جانتے ہیں کہ اس برّاعظم کی پوری ترقی کے اور جو طرزِ زندگی انھوں نے اپنے لیے تجویز کیا ہے اس کی حفاظت کے لیے یہاں بہت سے اور آسٹریلوی لوگوں کی ضرورت ہے۔

آسٹریلیا کے لوگوں کی شرح پیدائش خاصی ہے یعنی ۲۲،۷ فی ہزار۔ ایک سال سے کم عمر کے بچوں کی شرحِ اموات یہاں فی ہزار ۲۸،۵ ہے، جس کے مقابلے میں یہی شرح کینیڈا میں ۴۵، برطانیہ میں ۴۳ اور ریاستہائے متحدہ امریکا میں ۳۲ ہے۔ یہاں شرحِ اموات فی ہزار ۹،۷ ہے جو تمام دنیا سے کم ہے۔ جب بھی کوئی بچہ پیدا ہوتا ہے تو یہاں کی وفاقی حکومت اس کی ماں کو تقریباً تیس ڈالر کی رقم عطا کرتی ہے اور جوں جوں خاندان بڑھتا جائے اس رقم میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے اور یہ وظیفہ سولہ سال کی عمر تک جاری رہتا ہے۔ ہر خاندان کی فلاح و بہبود کے لیے حکومت نے ہسپتالوں، پنشنوں اور بے کاری کے وظیفوں کا نہایت فراخ دلی سے انتظام کر رکھا ہے۔ برطانیہ کی طرح یہاں بھی دواؤں کی تیاری کا کام حکومت کے ہاتھ میں نہیں ہے لیکن بہت سی فلاحی انجمنوں اور حکومت کے طبّی ادارے غریب سے غریب کنبوں کی طرف بھی پوری توجہ کرتے ہیں۔ ہر وہ مرد جس کی عمر پینسٹھ سال ہو چکی ہو اور ہر وہ عورت جو ساٹھ سال کی ہو اور جس کی سکونت بیس سال تک لگاتار آسٹریلیا میں رہی ہو بڑھاپے کی پنشن کے حق دار سمجھے جاتے ہیں جو تقریباً دس ڈالر فی ہفتہ ہوتی ہے۔

آبادی کے بڑھنے کی رفتار خواہ کتنی ہی ہو جائے پھر بھی آسٹریلیا کی ضرورت کے لیے کافی نہیں ہے۔ آئندہ ایک سو سال تک حکومت کی پالیسی یہ رہے گی کہ باہر سے آنے والوں کو یہاں بسایا جائے۔

نئی زمینوں کو آباد کرنے کی غرض سے پرانی بستیوں کی حکومتیں اکثر یہاں آکر آباد ہونے والوں کو مفت زمینیں دیتی ہیں۔ بعض حکومتوں نے آنے والوں کو ان کا سفر خرچ بھی دیا۔ وفاقی حکومت کے گزشتہ پچاس سال میں یہاں دو دفعہ بڑی تعداد میں آباد ہونے کے لیے باہر سے لوگ آئے۔ آنے والوں کی پہلی کھیپ پہلی جنگِ عظیم کے بعد یہاں پہنچی۔ ان میں زیادہ تر برطانیہ کے لوگ تھے جو پرانی دنیا اور وہاں کی مشکلات سے بچنے کے لئے یہاں قسمت آزمائی کے لیے آئے۔ اس وقت آسٹریلیا کی حکومت نے اُن میں سے بہتوں کو کرایے کی کچھ رقم بھی ادا کی۔ چنانچہ جنگ کے ختم ہونے کے بعد آسٹریلیا کی آبادی میں دس لاکھ کا اضافہ ہو گیا، لیکن اس کے بعد تمام دنیا میں اقتصادی بحران پیدا ہو گیا جس کی وجہ سے آسٹریلیا میں بھی بہت سے لوگ بے کار ہو گئے۔ اس وقت حکومت نے باہر سے آنے والوں کی امداد بند کر دی۔ اس کے بعد یہاں آکر بسنے والوں کی ایک اور چھوٹی سی لہر ۱۹۳۰ء کے بعد آئی۔ ان میں وہ لوگ شامل تھے جو ہٹلر کی طرزِ حکومت سے تنگ آکر ترکِ وطن پر مجبور ہو گئے تھے، لیکن اس موقع پر آنے والوں کی تعداد زیادہ نہ تھی۔

دوسری جنگِ عظیم کے بعد دولتِ مشترکہ حکومت نے دوسرے ملکوں کے لوگوں کو یہاں بسانے کی پالیسی پر ایک بار پھر بڑا زور دیا۔ جو لوگ دوسری جنگِ عظیم میں شریک ہوئے تھے، ان کو یہاں آنے کا کرایہ دیا جاتا تھا۔ بشرطیکہ وہ یہاں آباد ہونے اور کام کرنے کے لیے آئیں۔ برطانیہ کے دوسرے آباد ہونے والوں کو اس قدر مالی امداد دی گئی کہ انھیں اپنے پاس سے کرائے کے لیے صرف پچیس ڈالر دینے پڑے۔ چودہ سال کی عمر تک بچوں کو مفت لایا گیا اور چودہ سال اور انیس سال کے درمیان عمر والے نوجوانوں کو صرف دس ڈالر بطور کرایہ خرچ کرنے پڑے۔ آنے والوں کو آسٹریلیا میں کام دینے کا وعدہ بھی کیا گیا۔ جہازوں کے ذریعے سے آنے والوں کی فہرستیں بناتے وقت اکثر ایسے کاریگروں کو ترجیح دی جاتی تھی، جن کی زیادہ ضرورت تھی۔ چنانچہ انجینئروں اور عمارتوں کے کام کرنے والوں کو بہت آسانی سے جہازوں میں جگہ مل جاتی تھی۔ اس نظام کے مطابق سب سے پہلے برطانیہ کے لوگوں کو بلاوا

دیا گیا، کیونکہ ان کے آنے سے یہاں زبان کا کوئی مسئلہ پیدا نہ ہوتا تھا۔ یہاں پہلے ہی انگریزی زبان بولی جاتی تھی، لیکن اس کے بعد یورپ کے ہر حصّے سے بہت سے لوگ اپنے کنبوں کے ساتھ آنے لگے۔ آنے والوں میں سے ہزاروں کی تعداد میں وہ لوگ تھے جو بے گھر ہو کر کیمپوں میں جمع تھے۔ آسٹریلیا میں ان لوگوں کو پہلے عارضی طور پر سابقہ فوجی کیمپوں میں ٹھہرایا جاتا، انھیں انگریزی بولنے کی تعلیم دی جاتی اور پھر آہستہ آہستہ ان کو مختلف کاموں پر لگا دیا جاتا۔ کام جاننے والوں کو فارموں اور فیکٹریوں میں بھیج دیا جاتا۔ جو کچھ حکومت نے ان کے کرایے وغیرہ پر خرچ کیا تھا۔ اس کے عوض میں انھیں دو سال تک کام کرنے کا عہد کرنا پڑتا تھا لیکن یونین کی طرف سے مقرر کی ہوئی تنخواہیں ان کو باقاعدہ دی جاتی تھیں۔ اگرچہ ان میں کچھ غیر مطمئن لوگ بھی تھے، لیکن مجموعی طور پر اس منصوبے پر بہت اچھی طرح عمل ہوا۔ آباد ہونے والوں کو نیو آسٹریلینز کہا جاتا تھا۔ اور حکومت کی طرف سے ہر ممکن کوشش کی جاتی تھی کہ کوئی شخص نئے آنے والوں سے نفرت نہ کرے اور انھیں حقیر نہ سمجھے۔

درحقیقت یہ اتنا بڑا کام تھا کہ آسٹریلیا اسے بمشکل سنبھال سکا۔ ۱۹۵۰ء میں باہر سے آنے والوں کی رفتار آبادی کے تین فی صد سالانہ کے برابر تھی۔ یہ تعداد ریاست ہائے متحدہ امریکا کو آباد کرنے والوں کی انتہائی تعداد سے بھی زیادہ تھی لیکن اس کا نتیجہ تسلی بخش تھا۔ ۱۹۵۸ء کے اخیر تک آسٹریلیا میں پندرہ لاکھ نئے آنے والے آباد ہو چکے تھے۔

کوئی شخص یہ نہیں بتا سکتا کہ اس بڑھتی ہوئی آبادی سے آسٹریلیا کا ملک کتنا گنجان آباد ہو جائے گا اور اس برّ اعظم میں لوگوں کی زندگی کس قدر بدل جائے گی لیکن جو کچھ پچھلی ڈیڑھ صدی میں ہوا ہے اسے دیکھ کر اس بات کا یقین کیا جا سکتا ہے کہ آئندہ زمانے میں بھی آسٹریلیا کے لوگ ترقی اور خود اعتمادی کا ثبوت دیں گے اور کرۂ ارض کے اس دُور دراز حصّے میں رہتے ہوئے انسانی بہبود کے کاموں میں مصروف رہیں گے۔

بچوں کے لیے

دلچسپ اور مفید سائنسی معلومات کی کتابوں کا سلسلہ

(یہ سب کتابیں خوبصورت تصاویر سے مزین ہیں)

آنکھوں سے کام لیجیے	ترجمہ	محمد سعید	۱/۵۰
آواز کی کہانی	ترجمہ	مسعود احمد خاں	۱/۲۵
بچوں کے لیے سائنسی تحقیق کی نئی راہیں	ترجمہ	محمد فاروق	۲/۵۰
تمھارا جسم کیونکر کام کرتا ہے	ترجمہ	خلیق ابراہیم خلیق	۴/۵۰
ریڈیو اور ٹیلی ویژن	ترجمہ	سید ذوالفقار علی بخاری	۴/۵۰
حیوانی زندگی کا ماضی وحال	ترجمہ	ڈاکٹر نذیر احمد	۵/-
دنیا پر پہلی نظر	ترجمہ	سیدہ نسیم ہمدانی	۱/۵۰
زمین کی سرگذشت	ترجمہ	سید علی ناصر زیدی	۴/-
سائنس باتوں باتوں میں	ترجمہ	سید علی ناصر زیدی	۴/-
سائنس کے نئے اُفق	ترجمہ	سید علی ناصر زیدی	۵/-
ستاروں کی دنیا	ترجمہ	سید علی ناصر زیدی	۵/-
سائنس کی حیرت انگیز باتیں	ترجمہ	سید علی ناصر زیدی	۲/۵۰
عجائباتِ کیمیا	ترجمہ	محمد فاروق	۴/۵۰
سمندروں کی دنیا	ترجمہ	ڈاکٹر نذیر احمد	۴/۵۰
کیمیا کے رومان	ترجمہ	پروفیسر حمید عسکری	۵/-
موسم کی کہانی	ترجمہ	بشیر احمد ساجد	۴/۵۰

مؤسسہ مطبوعات فرینکلن، پوسٹ بکس ۳۶۹، لاہور

مشہور مہمات سائنس	ترجمہ	محمد فاروق	۴/۵۰
میرے اندر کیا ہے	ترجمہ	مولانا غلام رسول مہر	۱/۵۰

بنیادی سائنس کا سلسلہ

(بہترین آفسٹ طباعت رنگا رنگ تصاویر)

(مطبوعہ ایران)

انسانی مشین	ترجمہ	مولانا صلاح الدین احمد	۱/۵۰
آواز	"	"	۱/۵۰
پرندے	"	"	۱/۵۰
پھول پھل اور بیج	"	"	۱/۵۰
چاند	"	"	۱/۵۰
حرارت	"	"	۱/۵۰
روشنی	"	"	۱/۵۰
زندہ اشیاء	"	"	۱/۵۰
ستاروں سے آگے	"	"	۱/۵۰
کشش ثقل	"	"	۱/۵۰
کیڑوں کی سماجی زندگی	"	"	۱/۵۰
مٹی	"	"	۱/۵۰
مشینیں	"	"	۱/۵۰
مقناطیس	"	"	۱/۵۰
موسم	"	"	۱/۵۰

مطبوعات فرینکلن، پوسٹ بکس ۳۶۹، ۶۶۔ مزنگ روڈ، لاہور

فنی معلومات

(ذیل کی کتابیں بھی رنگین تصویروں سے مزین ہیں)

بجلی کی پہلی کتاب	ترجمہ	سید علی ناصر زیدی	۲/۵۰
ٹیلی فون کیسے کام کرتا ہے	ترجمہ	خلیق ابراہیم خلیق	۱/۲۵
خلاء میں سفر کی پہلی کتاب	ترجمہ	مولانا غلام رسول مہر	۲/۵۰
طیاروں کی پہلی کتاب	ترجمہ	مولانا غلام رسول مہر	۲/۵۰
موٹروں کی پہلی کتاب	ترجمہ	مولانا غلام رسول مہر	۲/۵۰

تاریخ

تاریخ بھی مزے کی چیز ہے (تصویردار)	ترجمہ	مولانا عبدالمجید سالک	۱/۵۰
سو تاریخی واقعات (تصویردار)	ترجمہ و ترتیب	مولانا غلام رسول مہر	۷/۰

سوانح

سو بڑے آدمی (تصویردار)	ترجمہ و ترتیب	مولانا عبدالمجید سالک	۵/۰
غریب لڑکے جو نامور ہوئے (مصوّر سرورق)	ترجمہ و ترتیب	مولانا عبدالمجید سالک	۴/۰
لڑکیاں جو نامور ہوئیں	ترجمہ ترتیب	اختر عزیز احمد مولانا عبدالمجید سالک	۵/۰
مشہور موجد اور ان کی ایجادیں	ترجمہ	ابوالحسن نغمی	۲/۷۵

ہماری دیگر مطبوعات

(والدین اور اساتذہ کی رہنما مصور کتابیں)

(یہ سب کتابیں تصویر دار ہیں)

آپ کے بچے کی وراثت	ترجمہ	شاہد احمد دہلوی	۱/-
بچوں کی بدتمیزیاں	"	"	۱/-
بچوں کے کھیل	"	"	۱/۵۰
بچے کی اخلاقی قدریں	"	"	۱/۵۰
کامیاب باپ	"	"	۱/۵۰
معاشرتی زندگی میں بچوں کی رہنمائی	"	"	۱/۵۰

صحت اور طب

بچہ اور اس کی دیکھ بھال	تصویر دار	ترجمہ	ڈاکٹر محمد عبدالقوی لقمان	۶/۵۰
آپ کے بچے کی صحت	تصویر دار	ترجمہ	شاہد احمد دہلوی	۱/۶۲
بیماری کے جذباتی اور نفسیاتی پہلو		ترجمہ	سید وقار عظیم	۱/۶۲
اتفاقات جو عظیم طبی کارنامے بن گئے		ترجمہ	ڈاکٹر محمد عبدالقوی لقمان	۵/-

سیاست

اقوام متحدہ	ترجمہ	فضل حق قریشی	۴/-
امریکہ کا سیاسی نظام	ترجمہ	مولانا صلاح الدین احمد	۲/۵۰

مذہب و اسلامیات

خدا ہمارے ساتھ ہے	ترجمہ	مولانا صلاح الدین احمد	۱/۲۵
خدا موجود ہے	ترجمہ	پروفیسر عبدالحمید صدیقی	۲/۵۰
اسلام اور قانون جنگ و صلح	ترجمہ	مولانا غلام رسول مہر	۹/-

تعلیم و تعلّم

آزاد تعلیم اور جمہوری نصب العین	ترجمہ	سید وقار عظیم	۳/-
بچے کی تعلیم میں گھر اور مدرسے کا تعاون	ترجمہ	فضل محمد خاں	۸/-
تعلیم کے مقاصد	ترجمہ	ڈاکٹر سید محمد عبداللہ	۵/۵۰
مدرسے کی زندگی میں بچے کی رہنمائی	ترجمہ	سید وقار عظیم	۱/۶۲
والدین اور معلّمین	ترجمہ	شاہد احمد دہلوی	۱/۵۰

انسانیات

مستقبل کا انسان	ترجمہ	سید قاسم محمود	۶/-
ثقافت کا مسئلہ	"	"	۱/-
قدیم تہذیب اور جدید انسان	"	"	۳/۵۰
قدیم علوم اور جدید تہذیب	ترجمہ	سید ہاشمی فرید آبادی	۱/-

تاریخ

انسائیکلوپیڈیا تاریخ عالم	ترجمہ	مولانا غلام رسول مہر	
جلد اوّل، تاریخ اسلام	"	"	۱۲/-
جلد دوم، تاریخ عالم	"	"	۱۲/-
جلد سوم	"	"	۱۴/-

تاتاریوں کی یلغار	ترجمہ	عزیز احمد	۱۲/-
صلیبی جنگیں	ترجمہ	سید رئیس احمد جعفری	۵/-
عرب دنیا	ترجمہ	ڈاکٹر محمود حسین	۱۲/-
کتابیں جنھوں نے دنیا بدل ڈالی	ترجمہ	مولانا غلام رسول مہر	۶/-

سوانح

ایڈیسن	ترجمہ	محمد سعید	۳/۵۰
چند عظیم علمائے جراثیم	ترجمہ	عبدالمجید قریشی	۱۰/-
سقراط	ترجمہ	آنسہ صبیحہ حسن	۲/۵۰
غازیان تہذیب	ترجمہ	سید ہاشمی فرید آبادی	۵/-
سلطان صلاح الدین ایوبی	ترجمہ	پروفیسر محمد یوسف عباسی	۱۷/۵۰
نور محل	ترجمہ	شبلی ایم کام و حبیب اشعر دہلوی	۷/۵۰

معاشیات

آبادی کا مسئلہ	ترجمہ	شبلی ایم کام	۱/۵۰
خوراک کا مسئلہ	ترجمہ	〃 〃 〃	۱/۵۰
عظماء کے معاشی نظریات	ترجمہ	ڈاکٹر ایس ایم اختر	۶/-

فلسفہ

داستانِ فلسفہ	ترجمہ	سید عابد علی عابد	۱۶/-
ناقابلِ تسخیر ذہنِ انسانی	ترجمہ	محمد صفدر میر	۲/۵۰
فلسفے کی نئی تشکیل	ترجمہ	انتظار حسین	۲/-

فنونِ لطیفہ

شاہکار تصاویر	ترجمہ و ترتیب	سیّد امتیاز علی تاج	۷/۵۰

جغرافیہ اور سیاحت

عرب اور اہلِ عرب	ترجمہ	مولانا غلام رسول مہر	۶/۰
نیویارک سے پیرس تک پہلی پرواز	ترجمہ	گروپ کیپٹن فیاض محمود	۳/۵۰
یہ ہے شمالی افریقہ	ترجمہ	سیّد عابد علی عابد	۲/۵۰

ناول، افسانے، ڈرامے

انجان راہی	ترجمہ	شان الحق حقی	۳/۵۰
بادبان	ترجمہ	سیّد قاسم محمود	۶/-
بشر ہے کیا کہیے	ترجمہ	سیّد عابد علی عابد	۹/۵۰
پہلا خون	ترجمہ	غلام حسین	۲/۵۰
چنگیز خاں کے سنہرے شاہین	ترجمہ	اشفاق احمد	۶/-
دھوپ چھاؤں	ترجمہ	ولی اشرف صبوحی	۷/۰
زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے	ترجمہ	سیّد رئیس احمد جعفری	۳/۵۰
شہر پناہ	ترجمہ	ابنِ انشا	۳/۵۰
گھاس کا سمندر	ترجمہ	سیّد قاسم محمود	۱/۵۰
قیامت کی رات	ترجمہ	سیّد عابد علی عابد	۷/-
مغرور	ترجمہ	سیّد رئیس احمد جعفری	۴/۰
ننھی بی بیاں	ترجمہ	حجاب امتیاز علی	۵/۵۰

نئے پرانے	ترجمہ	محمد یوسف عباسی	۴/-
ہمیں چراغ ہمیں پروانے	ترجمہ	قرۃ العین حیدر	۱۰/-
ویران ہے دل	ترجمہ	قیسی رامپوری	۶/-
اندھا کنواں	ترجمہ	ابنِ انشا	۷/۵۰
انوکھی کہانیاں	ترجمہ	شاہد احمد دہلوی	۵/-
بڑا ریچھ	ترجمہ	ولی اشرف صبوحی	۳/۵۰
پاپ کی نگری	ترجمہ	سیدہ نسیم ہمدانی	۶/-
حیرت ناک کہانیاں	ترجمہ	شاہد احمد دہلوی	۴/-
قصص الحمرا	ترجمہ	سید وقار عظیم	۷/۵۰
خزانے کی تلاش	ترجمہ	شبلی ایم کام	۲/۵۰
سورج کے ساتھ ساتھ	ترجمہ	عشرت رحمانی	۶/۵۰
لاکھوں کا شہر	ترجمہ	ابنِ انشا	۳/۵۰
ایک حمام میں	ترجمہ	عشرت رحمانی	۳/-
پھول کی پتی، ہیرے کا جگر	ترجمہ	ہلال احمد زبیری	۶/-

نئی کتابیں

آدمی کی انسانیت	ترجمہ	مولانا محمد بخش مسلم	۷/۵۰
فلسفے کا نیا آہنگ	ترجمہ	بشیر احمد ڈار	۳/۵۰
کائنات اور ڈاکٹر آئن شٹائن	ترجمہ	میجر آفتاب حسن	۱/۷۵
مشرق و مغرب کو ملنا ہی پڑے گا	ترجمہ	سید ہاشمی فرید آبادی	۱/۷۵
کیا سائنس ہمیں بچا سکتی ہے	ترجمہ	پروفیسر عبدالواحد	۱/۷۵

مؤسسہ مطبوعات فرینکلن، پوسٹ بکس ۳۶۹، لاہور

مُرقعِ اقوامِ عالم

اِس سلسلے کی کتابوں کا مقصد یہ ہے کہ بچّوں کو دُنیا کی برادری کی مختلف قوموں کی طرزِ زندگی، ا
تاریخ اور ان کے ملکوں کے متعلق مستند اور دلچسپ معلومات بہم پہنچائی جائیں۔ ہر کتاب میں معلومات
علاوہ خوبصورت اور دلچسپ تصاویر بھی شامل ہیں۔ ان کتابوں کے مصنّفوں نے یہ کتابیں متعلقہ
کی سیاحت کرکے بڑی تحقیق کے بعد لکھی ہیں۔ اس لیے ان میں مندرج معلومات بہت مستند ہیں

سرزمین اور باشندے	تصنیف	ترجمہ
آسٹریلیا	بلنڈن	عبدالحمید قریشی
بلجیم	لوڈر	غلام رسول مہر
چین	سپنسر	علی ناصر زیدی
مصر	زکی نجیب محمود	ہاشمی فرید آبادی
انگلستان	سٹریٹ	علی ناصر زیدی
فرانس	بریگڈن	عبدالحمید قریشی
جرمنی	ورزکرش	عبدالحمید قریشی
یونان	گیاناگوس	عبدالحمید قریشی
ہالینڈ	بارنو	صادق علی دلاوری
انڈونیشیا	ڈیٹس سی سمتھ	ابوالحسن نغمی
اٹلی	ونوار	غلام رسول مہر
جاپان	واگان	غلام رسول مہر
سپین	لوڈر	ہاشمی فرید آبادی
ترکی	سپنسر	غلام رسول مہر

شیخ غلام علی اینڈ سنز، پبلشرز، لاہور، پشاور، حیدر آباد، کراچی